علمی تحقیق

کیا قرآنِ کریم میں سائنس کی تعلیم بھی ہے؟

مولانا محمد معاویہ سعدی
استاذ شعبۂ تخصص فی الحدیث مظاہر علوم سہارنپور

آج کل یہ مضمون بہت عام کیا جارہا ہے کہ قرآنِ کریم طبیعی وغیر طبیعی تمام علوم کا منبع وسرچشمہ ہے، لہٰذا جس طرح قرآن کی تلاوت اور تعلیم: وحیٔ الٰہی کے پیغام کو جاننے، باری تعالیٰ کی ذات وصفات کی معرفت حاصل کرنے اور اس کے اَحکام کا علم حاصل کرنے کے لیے کی جاتی ہے، اِسی طرح اس کا ایک بنیادی اور اساسی مقصد: سائنسی اور طبیعاتی علوم وفنون کی تلاش وجستجو بھی ہے، اِسی لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے کلامِ پاک میں متعدد مقامات پر، مختلف پیرایوں میں ''آیات اللہ فی الکون'' (اللہ کی قدرت کی نشانیوں) کا تذکرہ فرماتے ہوئے لوگوں کو اُن میں غور وفکر کرنے کی دعوت دی ہے!۔ گویا ''سائنسی علوم وفنون'' بھی قرآن کا ایک مستقل موضوع ہیں!۔

چنانچہ بہت سی جدید عربی اور اردو تفاسیر اور مختلف رسائل وجرائد اور مقالات ومضامین میں ضمناً، اور ''قرآن وسائنس'' کے موضوع پر لکھی گئی بعض کتابوں میں مستقلاً، یہ مضمون نہایت قوت کے ساتھ انتہائی زور وشور سے بیان کیا جارہا ہے۔

مگر کیا واقعی ''سائنسی علوم وفنون'' قرآن کے موضوعات اور مقاصد کا حصہ ہیں؟ یا صرف بطور تذکرہ ضمناً اُن کا قرآن میں ذکر آیا ہے؟ پیشِ نظر مضمون میں بتوفیقہ تعالیٰ اِسی موضوع پر مدلل گفتگو کی کوشش کی گئی ہے۔

قرآنی علوم اور موضوعات:

اِس میں شک نہیں کہ قرآنِ کریم علوم ومعارف کا سمندر، عجائب وغرائب کا بحرِ ذخار، اور دقائق وحقائق کا ایک زندہ معجزہ ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کے نزول کے دن ہی سے، مختلف پہلوؤں سے اس کی تفسیر وبیان اور تشریح وترجمانی کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے تو آج تک اُس کا تسلسل قائم ہے، اور قرآنی علوم

ہیں کہ ان کی دریافت اور تحقیق کسی طرح مکمل ہی نہیں ہو پا رہی ہے: لاتنقضي عجائبه کا سماں ہر پل اور ہر آن ہے، ہر آنے والے محقق پر ایسے ایسے لطائف ومعانی کے انکشافات ہوتے ہیں کہ بے ساختہ زبان پر یہ جملہ آتا ہے: كَم تَرَكَ الأَولُ للآخِرِ (کتنے ہی پہلو ہیں جو پہلوں نے پچھلوں کے لیے چھوڑ رکھے ہیں!)۔

تاہم یہاں تین الگ الگ بحثیں ہیں: ایک تو ہے قرآن کا موضوع اور مقصد۔ دوسرے ہے قرآن میں موجود علوم وفنون۔ تیسرے اُن علوم وفنون کے ذکر کا مقصد۔ ذیل میں تینوں ہی بحثوں سے متعلق مختصر گفتگو کی جاتی ہے، وباللہ التوفیق۔

قرآن کا اصل موضوع اور مقصد:

کتاب وسنت اور اقوالِ سلف کی روشنی میں قرآن کا موضوع اور مقصد تو متعین ہے، لہٰذا اِس سلسلے میں تو بس وہی مضامین اور تحقیقات ''قرآنی تفسیر'' کے طور پر لائقِ پذیرائی ہو سکتے ہیں جو قرآن کے اپنے بیان کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے موافق، اور سلفِ صالحین کے تعامل وتوارث سے ہم آہنگ ہوں، ذیل میں ہم اُن آیات، روایات، اور اقوالِ سلف کو ذکر کرتے ہیں جن سے قرآنی موضوعات کی نشاندہی اور قرآن کے بنیادی مقاصد کی تعیین ہوتی ہے۔

قرآنی موضوعات قرآن کی روشنی میں:

۱- ابتدائے قرآن ہی میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی اِس کتاب کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کی تین اہم ترین صفات بیان فرمائی ہیں، اِرشاد ہے: ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِلْمُتَّقِينَ، الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ [البقرۃ ۲، ۳] (یہ ایسی کتاب ہے جس میں کوئی شک وشبہ نہیں، یہ سراسر ہدایت ہے تقویٰ کے اُن خوگروں کے لیے جو کہ غیب پر ایمان رکھتے ہیں)۔

اِس میں قرآن کی پہلی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ اُس کی ہر ہر بات بالکل یقینی، قطعی اور ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہے، اِسی لیے عقل وتجربے پر پرکھنے کا انتظار کیے بغیر اس کے مضامین پر یقین کر لینا عقیدے کا حصہ ہے، اور اس میں ذرا بھی تردد کفر ہے۔

(واضح رہے کہ اِیمان لانے سے پہلے: اللہ کے وجود، اس کی وحدانیت، نبی کی رسالت

اور قرآن کی حقانیت: اِن چار اُمور کے اِثبات پر تو عقلی دلیل کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے، مگر ایمان لانے سے قبل اِن چار اُمور کے علاوہ کسی اور حکمِ الٰہی پر دلیل کا مطالبہ بے محل ہے، اور جب ایمان لے آئے تو پھر کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ سے ثابت شدہ کسی بھی بات کا اِنکار، یا اس میں شک وارتیاب موجب کفر ہے)۔

قرآن کی دوسری صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ جو لوگ اللہ کی معرفت حاصل کر کے اُس کی طرف جانے والے سیدھے راستے پر چلنا چاہتے ہیں، اور اُس کی عظمت، محبت اور خوف کی وجہ سے اُس کی فرمانبرداری کرنا چاہتے ہیں، تو ایسے لوگوں کے لیے قرآن کے مشمولات ومندرجات نصابِ ہدایت ہیں، لہٰذا اِس کتاب میں اُن کو وہ تمام باتیں ملیں گی جو ایک ”طالبِ ہدایت“ اور ”شائقِ تقویٰ“ کے لیے ضروری ہیں۔

تیسری صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ اُن ہی عاشقوں اور دیوانوں کے لیے ہے جو ”اِیمان بالغیب“ رکھنے کے لیے تیار ہوں، اور ”غیب“ کہتے ہی ہیں اُن ربانی اور حقانی علوم کو جو سائنسی دسترس (عقل، تجربہ اور مشاہدہ) سے باہر ہوں، اور اُس کا سب سے بڑا فرد اللہ کی رضا وعدم رضا پر اطلاع ہے کہ وہ نہ عقل سے جانی جاسکتی ہے، نہ تجربے سے معلوم کی جاسکتی ہے، اور نہ ہی مشاہدہ میں آسکتی ہے، اُس کا واحد ذریعہ وحیِ الٰہی ہے، جس کا مجموعہ ”کتاب وسنت“ کہلاتا ہے۔

قرآن کی اِن تین صفات کے بیان سے اُس کے موضوع اور مقصد پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ اس کا موضوع ثابت شدہ حقائق کا بیان ہے، ممکنہ نظریات نہیں۔ اِسی طرح اُس میں تقویٰ وآخرت سے متعلق مضامین ہیں، نفسانی خواہشات اور دنیاداری سے متعلق نہیں۔ نیز وہ ایمان بالغیب کی دعوت دیتا ہے، عقل ومشاہدہ کے تجربات کی نہیں؛ اِلا یہ کہ اُن کا مقصد بھی اِیمان بالغیب تک پہنچنا ہو۔

قرآن کے برعکس سائنس کا موضوع صرف وہ ممکنات ہوتے ہیں جن کی تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر تصدیق یا تکذیب کی جاسکے، لہٰذا نہ تو اُس کے نظریات قرآن کی طرح یقینی اور قطعی ہوتے ہیں، نہ ہی اُس میں ”غیب“ (اور مابعد الطبیعات) سے بحث کی جاسکتی ہے (بلکہ فی الجملہ اُس کا اِنکار ہی پایا جاتا ہے)، اور اِسی کے نتیجے میں اللہ کی عظمت اور خوف سے ناشی ہونے والے ”تقویٰ“ کا، نیز اُس پر ایمان لا کر اُس کی غیر مشروط تابعداری وفرمانبرداری کا بھی کوئی تصور نہیں پایا جاتا، بلکہ اِن چیزوں کا یا تو بالکلیہ اِنکار پایا جاتا ہے، یا بس اُس حد تک اقرار کیا جاتا ہے جہاں تک سائنٹیفک اصولوں سے ان کی مزاحمت نہ ہو، لہٰذا جن شرعی

مسائل میں سائنسی اصول سے ٹکراؤ محسوس کیا جاتا ہے، اُن کی حقانیت کا اِنکار کردیا جاتا ہے۔

۲– قرآنِ کریم کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: إِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا كَبِيرًا، وَأَنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا[الإسراء: ۹، ۱۰]

یقیناً یہ قرآن اُس راستے کی رہنمائی کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے، اور اُن اِیمان والوں کو بشارت سناتا ہے جو نیک اعمال کرتے ہیں کہ اُن کے لیے بہت بڑا اجر ہے، اور یہ کہ جو لوگ آخرت پر اِیمان نہیں لائیں گے ہم نے ان کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اِن آیات میں قرآن کی تین صفات بیان کی گئی ہیں: ایک یہ کہ وہ صراطِ مستقیم کی رہنمائی کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ اہلِ اِیمان کے لیے بشیر ہے۔ تیسرے یہ کہ وہ اِیمان نہ لانے والوں کے لیے نذیر ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ تینوں ہی اپنے انجام کے لحاظ سے اُمورِ آخرت سے متعلق ہیں، مادِی دنیا کی کامیابی، یا نامرادی سے متعلق نہیں۔

۳– ایک اور جگہ قرآنِ کریم کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللّٰهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ، يَهْدِي بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ وَيَهْدِيهِمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ[المائدۃ ۱۵، ۱۶]

تحقیق کہ آچکا ہے تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور اور ایک کھلی ہوئی کتاب، جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو سلامتی کے راستوں کی ہدایت دیتا ہے جو اُس کی خوشنودی کی تلاش میں رہتے ہیں، اور اُن کو اپنے حکم سے — کفر، شرک، بدعت، جہالت، غفلت اور معصیت — کی تاریکیوں سے — ایمان، اسلام، سنت، علم، یادِ الٰہی اور طاعت — کی روشنی کی طرف لے جاتا ہے، اور اُن کو ایسے راستے کی رہنمائی کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے۔

اِس تفصیلی بیان میں قرآنِ کریم کی متعدد صفات کا ذکر آگیا ہے، جن سے قرآنی موضوعات پر نہایت وضاحت کے ساتھ روشنی پڑتی ہے، اور یہ اچھی طرح معلوم ہوجاتا ہے کہ قرآن کا بنیادی مقصد اللہ کی خوشنودی کی تلاش کرنے والوں کی درست رہنمائی کرنا ہے، مادیت اور دنیا کے طالبین کی تشنگی دور کرنا نہیں۔

۴– ایک اور جگہ اِرشاد فرمایا گیا: يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ[یونس ۵۷]

اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے آپہنچا ہے پیغامِ نصیحت، اور سینوں میں چھپی

بیماریوں کے لیے شفاء کامل، اور لوگوں کی ہدایت کا سامان، اور خاص اہلِ ایمان کے لیے سراپا رحمت۔

اِس آیت میں بیان کردہ تمام صفات سے بھی قرآنِ کریم کے موضوع اور مقصد پر واضح طور پر روشنی پڑتی ہے کہ وہ غفلت میں پڑے انسانوں کو بیدار کرنے، روحانی امراض میں مبتلا لوگوں کا علاج کرنے، اور راہِ ہدایت سے بھٹکے ہوؤں کی رہنمائی کرنے والی کتاب ہے، اور جو لوگ اس کی ہدایات کو قبول کر کے اس پر ایمان لے آئیں اس میں اُن کے قلوب کی تسکین کا سامان بھی ہے۔

قرآنی موضوعات حدیث کی روشنی میں

سیدنا حضرت علیؓ سے مروی سننِ ترمذی (۲۶۰۹) وغیرہ کی ایک طویل روایت ہے (جو فی نفسہ تو ضعیف ہے، مگر بحیثیتِ مجموعی حسن درجے کی ہو سکتی ہے)، اس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں: **كتابُ الله: فيه نبأُ ما قبلكم، وخبرُ ما بعدكم، وحُكم ما بينكم، وهو الفصل ليس بالهزل ... الحديث.** اس میں قرآن کی جو اہم صفات وارِد ہوئی ہیں ان کا ترجمہ یہ ہے:

> اللہ کی کتاب: اس میں تم سے پہلوں کی تاریخ بھی ہے، تمھارے بعد کی پیشین گوئی بھی ہے، اور تمھارے معاملات کا حکم بھی ہے، اور وہ دوٹوک فیصلہ کرنے والی ہے، ہنسی کھیل نہیں ہے.....، اور وہ اللہ کی مضبوط رسی ہے، اور حکمت بھرا ذکر ہے، اور صراطِ مستقیم ہے، اس کے رہتے فکر بھٹکتا نہیں، زبان لڑکھڑاتی نہیں، اور علماء اس سے آسودہ نہیں ہوتے، اور بار بار پڑھنے سے بھی وہ پرانا (اور بے مزہ) نہیں ہوتا، اور اس کے عجائبات کی کوئی انتہا نہیں، یہ وہی قرآن ہے جسے سن کر جن بھی خاموش نہ رہ سکے، اور پکار اٹھے: ہم نے تو ایک عجیب ہی قرآن سنا ہے، جو بھلائی کا راستہ دکھاتا ہے۔

اِسی روایت کے بعض طرق میں یہ معنی بھی وارِد ہوئے ہیں:

> یہ اللہ کی وہ زبردست کتاب ہے کہ باطل نہ اس کے آگے سے آسکتا ہے، اور نہ پیچھے سے، یہ ایسی ذات کی طرف سے اتاری گئی ہے جو حکمت والی قابلِ ستائش ہے، جو اسے چھوڑ کر کہیں اور علم حاصل کرے گا اللہ اسے گمراہ کردے گا، اور جو سرکش خلافتِ ارضی کا والی بن جائے، پھر فیصلے اس کو نظر انداز کر کے کرے، تو اللہ اُسے توڑ دے گا، اور یہ کھلا ہوا نور ہے.....الخ)۔

اِس حدیث سے بھی قرآنی موضوعات کے مختلف پہلوؤں پر نظر پڑتی ہے، اور ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کا اصل موضوع: اگلوں کے حالات سے عبرت ونصیحت عطا کرنا، لوگوں میں تعلق مع اللہ پیدا کرنا، اور اللہ کی تابعداری اور فرمانبرداری کے طریقے کی رہنمائی کرنا ہے۔ اور اس میں جو **لا تنقضي عجائبه** (اس

کے عجائبات کی کوئی انتہا نہیں) کا جملہ وارِد ہوا ہے اُس سے متعلق بحث ہم اِن شاء اللہ آئندہ کریں گے۔

قرآنی موضوعات اقوالِ سلف کی روشنی میں

علامہ ابن جریر طبریؒ فرماتے ہیں: قرآن بنیادی طور پر تین موضوعات پر مشتمل ہے: توحید وعقائد، اَحکام ومسائل، اور قصص واَخبار۔ علی بن عیسیٰ ربعیؒ نے ابن جریر پر استدراک کرتے ہوئے مجموعی طور پر تیس علوم بیان فرمائے، تو قاضی ابو المعالی شیذلہؒ نے ان کا تعاقب کرتے ہوئے فرمایا: کہ اگر تفصیل میں جایا جائے تو قرآنی علوم بے شمار ہیں، اور اِجمالی طور پر یہ تمام تیس علوم ابن جریر کے بیان کردہ تین علوم میں آجاتے ہیں۔

قاضی ابن العربیؒ فرماتے ہیں: کہ ویسے تو قرآن کا ہر ہر لفظ موتی، اور ہر ہر کلمہ حکمت ہے، اِس لحاظ سے تو قرآن میں بے شمار علوم وفنون ہیں، مگر بنیادی طور پر تین ہی علوم اس کا موضوع ہیں: توحید، تذکیر اور اَحکام (البرہان فی علوم القرآن للزرکشی ا/۱۷-۱۸)۔

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں: ''... قرآن جس فن کی کتاب ہے اس میں سب سے ممتاز ہونا یہ فخر کی بات ہے، یعنی اِثباتِ توحید واِثبات معاد واصلاحِ ظاہر وباطن۔ اگر سائنس کا ایک مسئلہ بھی اس میں نہ ہو کوئی عیب نہیں، اور اگر سائنس کے سب مسئلے ہوں تو فخر نہیں، قرآن کو ایسی خیر خواہی کی ضرورت نہیں، واللہ تعالیٰ اعلم''۔ (امداد الفتاوی، ج۶ص ۱۶۰-۱۶۲)۔ (باقی آئندہ)

خوشی کا سبب

کثرت کے ساتھ استغفار پڑھنے والا شخص قیامت کے دن اپنا نامۂ اعمال کو دیکھ کر خوش ہوگا۔

حضرت زبیرؓ فرماتے ہیں: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو یہ چاہتا ہے کہ اپنا اعمال نامہ دیکھ کر خوش ہو، اس کو چاہیے کہ بکثرت استغفار پڑھا کرے۔

''وَعَنِ الزُّبَیْرِ رضی اللہ عنہ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ أَحَبَّ أَنْ تَسُرَّهُ صَحِيْفَتُهُ فَلْيُكْثِرْ فِيْهَا مِنَ الْاِسْتِغْفَارِ۔'' (رواہ ابوداؤد، رقم الحدیث ۱۴۸۹)

علمی تحقیق | دوسری قسط

کیا قرآنِ کریم میں سائنس کی تعلیم بھی ہے؟

مولانا محمد معاویہ سعدی
استاذ شعبۂ تخصص فی الحدیث مظاہر علوم سہارنپور

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ فرماتے ہیں: قرآن کے بنیادی علوم پانچ ہیں:

۱۔ احکام ومسائل، خواہ وہ عبادات ومعاملات کی قبیل سے ہوں، خواہ معاشرت اور سیاست سے متعلق ہوں، اور یہ سب فقہ اور فقہاء کا موضوع ہیں۔

۲۔ جدل ومناظرہ، چاہے وہ مشرکین سے ہو، چاہے اہلِ کتاب سے، اور چاہے اسلام کی طرف منسوب فرقِ باطلہ سے، اور یہ سب علمِ کلام اور متکلمین کا موضوع ہیں۔

۳۔ تذکیر بآلاء اللہ، یعنی کائنات میں جو کچھ اللہ نے بندوں کے نفع کے لیے پیدا کیا ہے اُس میں غور وفکر کرکے اُس سے تشکر وامتنان کا اظہار کرنا۔

۴۔ تذکیر بایام اللہ، یعنی گذشتہ اُمتوں کے ساتھ اللہ نے انعام واکرام، یا عقاب وعذاب کے جو معاملات فرمائے ہیں اُن میں غور کرکے اُن سے عبرت ونصیحت حاصل کرنا۔

۵۔ تذکیر بالموت ومابعد الموت، یعنی قبر، حشر، نشر اور دیگر اُمورِ آخرت کا اور وہاں پیش آنے والے جزا وسزا کے مراحل کا تصور کرکے، اُن سے تذکر وموعظت حاصل کرنا۔ اور یہ تینوں ہی علوم تصوف وصوفیاء کے موضوعات ہیں۔ (الفوز الکبیر فی أصول التفسیر ص: ۲۹)۔

قرآن میں واردِ "تِبیانا لِکُلِّ شَيْءٍ" اور حدیث میں واردِ "لا تَنقَضِي عجائبہ" کا مطلب؟

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ حضراتِ مفسرین تو قرآنی علوم کو محدود ومحصور فرما رہے ہیں، جب کہ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن کے بارے میں فرمایا ہے: "وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ" (اور ہم نے آپ پر اِس کتاب کو اتارا ہر چیز کا بیان بنا کر)۔

اور حدیث شریف میں اِس کی صفت وارد ہوئی ہے: "لا تنقضي عجائبہ" (اس کے عجائبات کی

کوئی انتہا نہیں)۔تو اس کا کیا جواب ہوگا؟

اِس کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو یہاں قرآن کے دو پہلو ہیں:ایک تو ہے قرآنی مقاصد اور موضوعات۔ دوسرے قرآن میں وارِد مضامین اور حقائق۔تو جب قرآن کے موضوع اور مقصد پر گفتگو کی جائے گی تو وہ تو وہی ہے جس کا بیان پہلے تفصیل سے گذر چکا،یعنی اِثباتِ توحید و اِثبات معاد و اصلاحِ ظاہر و باطن۔ہاں جب قرآنی اعجاز اور وسعت و جامعیت پر گفتگو کی جائے تو اس کے ضمن میں قرآنی تعبیرات اور نکات و لطائف کا میدان کافی وسیع ہے۔

اِسی لیے علماء نے فرمایا ہے کہ یہ جو قرآن کی تفسیر کے تحت صوفیائے کرام نِکات و لطائف بیان فرماتے ہیں یہ قرآن کی تفسیر نہیں ہوتی، بلکہ ان کو قرآن کی تفسیر کے طور پر بیان کرنا جائز بھی نہیں ہے، بلکہ یہ وہ معانی اور حقائق ہوتے ہیں جو تلاوتِ قرآن کے وقت کسی لفظ یا معنیٰ کی مناسبت سے اُن پر الگ سے منکشف ہوتے ہیں،لہٰذا اُن کو اسی درجہ میں رکھنا چاہیے(البرہان ۲/ ۱۷۰)۔

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:

> ... اورصوفیہ کی تاویل اس سے مستثنیٰ ہے، کیونکہ وہ ان معانی کے مدلولِ نص ہونے کے مدّعی نہیں، بلکہ اصل مدلولات کو قبول کر کے،ان مدلولات کے مشابہ کو بطور اِعتبار کے ظاہر کرتے ہیں۔
> (حکیم الامت : نقوش وتاثرات،ص ۱۰۶)۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ یہ اَمر تو مسلمات میں سے ہے کہ کسی بھی دعوی اور دلیل کا تعلق اُسی فن اور موضوع سے ہوتا ہے جس فن اور جس موضوع سے متعلق گفتگو پہلے سے چل رہی ہو،تو جب قرآن وحدیث میں قرآن کے مقاصد اور موضوعات متعین فرمادیئے گئے تو ظاہر سی بات ہے کہ قرآن کے ہر دعوی اور ہر دلیل کو اُسی خاص تناظر میں دیکھنا ضروری ہوگا،یہ نہیں کہ بات چل رہی ہے روحانی علاج کی، اور اس کو منطبق کرنے کی کوشش کی جائے جسمانی علاج پر، بات چل رہی ہو مغیبات پر اِیمان کے مطالبے کی، اور اس کو منطبق کیا جائے تجربات و مشاہدات سے ثابت شدہ چیزوں کے اِثبات پر، بات چل رہی ہو اَنفُس وآفاق میں غور وفکر کر کے تذکر و نصیحت حاصل کرنے، اور اس کے نتیجے میں دعوتِ توحید قبول کرنے کی، اور موضوع بدل کر اُس کو پہنچا دیا جائے کائناتی علوم وفنون کی مادی تحقیق وجستجو کی طرف۔

امام فخر الدین رازیؒ: اللہ تعالیٰ کے قول ’’وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ‘‘ کی تفسیر میں فرماتے ہیں :

قرآن ہر چیز کو بیان کرنے والا ہے؛ اِس طور پر کہ علوم یا تو دینی ہوں گے، یا غیر دینی، غیر دینی علوم یہاں مراد نہیں ہو سکتے، اِس لیے کہ قرآن کی تعریف اور توصیف اِسی میں ہے کہ اُس میں (بطور مقصود) صرف دینی علوم ہوں، غیر دینی علوم نہ ہوں، بہر حال علومِ دین تو وہ یا تو اصول (و عقائد سے متعلق) ہوں گے، یا فروع (و احکام سے متعلق)، پس اصول تو سب کے سب قرآن میں موجود ہیں، اور فروع میں سب سے اہم قاعدہ یہ ہے کہ ہر فرد دوسرے سے فارغ اور سبک دوش رہے، سوائے اُن حقوق کے جو اللہ نے ایک دوسرے سے متعلق فرمائے ہیں، تو جتنے حقوق ایک کے دوسرے پر ہوتے ہیں وہ بنیادی طور پر قرآن میں پائے جاتے ہیں، اِس لحاظ سے یہ تمام علومِ دین کا بیان ہو گیا! (تفسیر کبیر ۲۰/۲۵۸)۔

امام ابو بکر جصاص رازیؒ فرماتے ہیں:

دین کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کی اصل قرآن میں نہ موجود ہو، خواہ صراحتاً، خواہ دلالۃً یا اشارۃً، اِس لیے کہ بعض مسائل تو وہ ہیں جن سے قرآن نے براہِ راست تعرض کیا ہے، اور بعض مسائل وہ ہیں جو سنتِ رسول اللہ سے، یا اجماع سے، یا قیاس سے ثابت ہیں، اور اِن تینوں ہی کی حجیت اور دلیلِ شرعی ہونا قرآن سے ثابت ہے، اِس طرح سے اِن دلائلِ شرعیہ سے ثابت شدہ مسائل بھی درحقیقت قرآن ہی سے ثابت شدہ مسائل ہوئے۔ (احکام القرآن ۳/ ۲۴۶)۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:

بعض لوگ دعوی کیا کرتے ہیں کہ قرآن میں تمام علوم ہیں، حتی کہ تحقیقاتِ جدیدہ اور صنائع وغیرہ کے اُصول بھی، اور {تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ} سے استدلال کرتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں، قرآن جس غرض اور غایت کے لیے نازل ہوا ہے یعنی ہدایت و اصلاحِ معاد؛ اُس کے مسائل اِس میں سب ہیں، تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ سے مراد یہ ہے، کہ تبیاناً لکل شيء من مهمات الدين (دین کے تمام اہم اُصول اور مسائل کو واضح کرنے والی کتاب)، چنانچہ جابجا "ھدی" و "رحمۃ" و "نور" وغیرہ فرمایا گیا ہے، یہ اس کا صاف قرینہ ہے" اھ۔

احقر عرض کرتا ہے کہ خود اِس آیت کا آگے کا سیاق بھی اِسی مضمون کو واضح کرتا ہے، چنانچہ پوری آیت اِس طرح ہے: وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَى لِلْمُسْلِمِينَ[النحل۸۹]، (اور ہم نے آپ پر کتاب نازل کی ہے ہر چیز کا بیان بنا کر، اور لوگوں کی ہدایت کا سامان بنا کر، اور موجب رحمت و بشارت بنا کر فرمانبرداروں کے لیے)۔

ظاہر ہے کہ اِس کا رحمت اور بشارت ہونا صرف مسلمانوں ہی کے لیے ہے، جب کہ سائنس اور کائناتی علوم تو سب ہی کے لیے ہوتے ہیں، تو معلوم ہوا کہ یہاں "کل شیء" سے وہ مراد ہی نہیں ہیں، بلکہ

صرف وہ علوم مراد ہیں جن کی خدا تعالیٰ کی فرمانبرداری کے لیے ضرورت پڑتی ہے۔

اور رہی بات حدیث ’’لا تنقضي عجائبه‘‘ کی، تو مذکورہ بالا تفصیلات کی روشنی میں اُس کا مطلب بھی بالکل واضح ہے کہ یہاں ’’عجائبات‘‘ سے مراد وہی نوع بنوع مضامین اور لطائف وحقائق ہیں جو قرآنی مقاصد اور موضوعات کے دائرے میں ہوں، اور جن طبیعی علوم کا اس میں تذکرہ آیا ہے، یا جن کائناتی عجائبات کی دریافت کا اُس سے سرا ملتا ہے تو وہ اس کے اِضافی محاسن میں سے ہے، مقصود کے طور پر نہیں۔

چنانچہ ہر زمانے کے علماء قرآن کے بنیادی موضوع اور مقصد کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنے اپنے طور پر ایسے اضافی عجائبات اور اِعجازات کا ذکر فرماتے رہے ہیں، علامہ سیوطیؒ قرآن کی جامعیت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> قرآن میں آسمانوں اور زمین کے عجائبات، ثریا سے اوپر اور ثری کے نیچے تک کی معلومات، ابتدائے آفرینش کی اطلاعات، مشہور پیغمبروں کے حالات، فرشتوں کے تذکرے، گذشتہ امتوں کے واقعات، انبیاء خصوصاً حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور غزوات، انسانی پیدائش اور نشو ونما کے مختلف مراحل، پھر موت اور بعد الموت کے احوال، قیامت اور اس کی بعض نشانیاں، آخرت اور اس کے اہم حقائق، جنت اور اس کی نعمتیں، دوزخ اور اس کی سختیاں، توحید اور اس کے دلائل، نیز اِیمان کے ستر سے زائد شعبے، اسلام کی تین سو سے زائد شاخیں، صغیرہ وکبیرہ گناہوں کا تذکرہ...... وغیرہ ایسے اُمور ہیں جن کی مزید تفصیل کے لیے کئی جلدوں کی کتاب درکار ہوگی‘‘ (الاتقان ۴/ ۳۸)۔

پھر علامہ سیوطیؒ نے ایک مستقل فصل قائم کی ہے، جس کا عنوان ہی ہے: ’’قرآن سے مستنبط علوم وفنون‘‘، جس کے تحت پہلے تو قرآن کی جامعیت اور شمولیت کے سلسلے میں متقدمین علماء کے مختلف اقوال نقل فرمائے ہیں، پھر آخر میں محمد بن الفضل المرسیؒ (ت ۶۵۵ھ) کے حوالے سے ایک طویل مضمون درج فرمایا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

> علمائے اِسلام نے جملہ علوم کی اَنواع واَقسام سب قرآنِ حکیم سے ہی اَخذ کی ہیں، ابتدا میں تو علماء میں کمال وجامعیت ہوتی تھی، تو ایک ہی شخص تمام علوم وفنون کا جامع ہوا کرتا تھا، پھر جب انحطاط کا دور شروع ہوا تو علوم وفنون کی تقسیم ہوتی گئی، اور ہر ہر علم وفن کے لیے الگ الگ افراد اور جماعتیں مخصوص ہوتی گئیں، مثلاً ایک جماعت نے قرآن کے لغات وکلمات کے ضبط وتحریر کا فریضہ اپنے ذمہ لے لیا، اور اُس نے مخارجِ حروف کی معرفت، کلمات کا شمار، سورتوں اور منزلوں کی گنتی، سجدات وعلاماتِ آیات کی تعداد وتعیین، حصرِ کلمات، متشابہ ومتماثل آیات کا اِحصاء وغیرہ پہلوؤں پر کام کیا، تو اُن کا نام ’’قراء‘‘ رکھا گیا (اِس طرح ’’علم القراۃ والتجوید‘‘ منصۂ شہود پر آیا)۔

بعض نے قرآن کے معرب ومبنی، اسماء وافعال، حروفِ عاملہ وغیر عاملہ، اسماء وتوابع، رسم الخط وغیرہ کی طرف توجہ کی تو وہ ''نحاۃ'' کہلائے (اوران کے ذریعے ''علم النحو'' معرضِ وجود میں آیا)۔

بعض نے الفاظِ قرآن، ان کی دلالت واقتضاء، پھر ان کی تاویل وتشریح، اوران کے مطابق ہر حکم کی تفصیلات کو اپنا موضوع بنایا تو یہ ''مفسرین'' کہلائے (اوران کے ذریعے ''علم التفسیر'' وجود میں آیا۔

اِسی طرح سے محمد بن الفضل مرسیؒ نے علمِ کلام، فقہ، اُصول فقہ، تصوف، معانی، بیان، بدیع، تعبیر الرؤیا، وعظ وخطابت، تاریخ وقصص، معاملات، سیاست، دفاعی اُمور، اِن کے علاوہ طب، جدل ومناظرہ، ریاضی، ہیئت، ہندسہ، جبر، مقابلہ، فلکیات، اور صنعت وحرفت کی مختلف شکلوں کا قرآن سے ربط واستنباط دکھلایا ہے، اور آخر میں فرمایا کہ درحقیقت کائنات میں جو کچھ موجود ہے، یا آئندہ ہوگا وہ سب کا سب بھی قرآن سے مستنبط ہوسکتا ہے (الاتقان ۴؍۳۰-۳۶)۔

ایک موقع پر حضرت تھانویؒ نے ''قرآنِ کریم کے اِرشاد: أَلَمْ نَجْعَلْ لَهُ عَيْنَيْنِ، وَلِسَانًا وَشَفَتَيْنِ (البلد۸-۹) (کیا ہم نے اس کو دو آنکھیں اور زبان اور دو ہونٹ نہیں دیئے) کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ:

... دوسرا نکتہ یہ ہوسکتا ہے کہ یہ اِشارہ ہو ایک مسئلۂ طبیعیہ کی طرف کہ وہ دو ہیں، مگر بمنزلہ ایک کے، کیوں کہ دونوں آنکھیں ایک وقت میں ایک ہی چیز کو دیکھ سکتی ہیں، ایسے ہی شفتین، کہ دونوں سے ایک ہی کلام ہوسکتا ہے، یہ نہیں کہ ایک آنکھ سے ایک چیز کو دیکھ لیں، اور دوسری سے دوسری کو، ایک ہونٹ سے ایک بات کرتے رہیں، اور دوسرے سے دوسری بات کرنے لگیں۔

قرآن شریف کی یہ شان ہے:

بہارِ عالمِ حسنش دل و جاں تازہ می دارد
برنگ اصحابِ صورت را ، ببُو اَربابِ معنی را

اس کے عالمِ حسن کی بہار؛ ظاہر پرستوں کے دل وجاں کو رنگ وروپ سے، اور حقیقت پرستوں کے دل وجاں کو اپنی خوشبو سے تروتازہ رکھتی ہے

پھر آخر میں حضرتؒ نے فرمایا:

اور کوئی یہ نہ کہے کہ تم تو قرآن شریف میں حکمتِ طبیعیہ کے مسائل نکالنے سے منع کیا کرتے ہو! بات یہ ہے کہ قرآن شریف میں حکمت کے مسائل مقصود نہیں، باقی کہیں نکل آویں تو اِس سے مجھ کو اِنکار نہیں، البتہ ''الضرورۃ یتقدر بقدر الضرورۃ'' ضرورتاً اِختیار کی جانے والی چیز بقدرِ ضرورت ہی اِختیار کی جاتی ہے'' کے قاعدے کا لحاظ ضروری امر ہے... الخ''

(اشرف الجواب ج۲ص۲۹۹-۳۰۰)۔ باقی آئندہ

علمی تحقیق — تیسری قسط

کیا قرآنِ کریم میں سائنس کی تعلیم بھی ہے؟

مولانا محمد معاویہ سعدی
استاذ شعبۂ تخصص فی الحدیث مظاہر علوم سہارنپور

گذشتہ تفصیلات سے بحمد اللہ یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ قرآنِ کریم کا بنیادی موضوع اور مقصد: توحید کی دعوت دینا، عقائد کی اصلاح کرنا، فکرِ آخرت پیدا کرنا، اخلاق کا تزکیہ کرنا، فقہی احکام ومسائل بیان کرنا، حکمت وتدبر کی تعلیم دینا، اور فرد ومعاشرہ کی ظاہری وباطنی اصلاح کے لیے مختلف انداز میں پند و نصیحت اور عبرت وموعظت کو ذکر کرنا ہے۔

اور یہ تذکرہ بھی بفضلہٖ تعالیٰ اچھی طرح آ گیا کہ بطور مقصود کے تو نہیں، مگر ضمناً اور اشارتاً قرآن کریم کا ہر ہر لفظ اور ہر ہر حرف ایسے گہرے حقائق پر مشتمل، اور ایسے وسیع تصورات کو حاوِی ہے کہ جن کے پیچھے علوم وفنون کا ایک پورا گنجینہ، اور حقائق ومعارف کا پورا خزانہ موجود ہے۔

اَب یہاں صرف یہ بتانا باقی رہ گیا ہے کہ ضمناً اور اشارتاً ہی سہی، مگر اِن علوم وفنون کے قرآن میں ذکر کرنے کا مقصد کیا ہے؟۔

قرآن میں اِضافی علوم وفنون کے ذکر کا مقصد:

پہلی بات تو یہ کہ قرآنِ کریم خالقِ کائنات اور باری تعالیٰ کا کلام ہے، لہٰذا اُس میں جب بھی کسی بھی موضوع پر گفتگو کی جائے گی تو اس کی تعبیرات اور الفاظ میں یقیناً ایسی لطافت، باریکی اور گہرائی ملحوظ ہوگی جو ’’حقائق الاشیاء‘‘ اور واقع کے مطابق ہو (الا یہ کہ کہیں معنیٔ مجازی ہی مراد ہوں)، اِس لیے کہ کسی بھی شے کی حقیقت کو اس کے موجد (پیدا کرنے والے) اور صانع (بنانے والے) سے زیادہ کون جان سکتا ہے؟!۔

تو یہ علوم وفنون اور حقائق ومعارف قرآن کے اصل مضامین اور مقاصد تو نہیں ہیں، البتہ اصل مقصود کے ضمن میں حاصل ہونے والے اضافی فوائد اور محاسن ضرور ہیں۔

دوسری بات یہ کہ قرآنِ کریم قیامت تک رہنے والا ایک زندہ وتابندہ معجزہ ہے، تو یہ اس کے کمالِ اعجاز کا حصہ ہے کہ اس پر جس زاویہ سے نگاہ ڈالی جائے اسی طرح کے معانی اور مضامین اس سے مترشح ہوتے ہیں، اب دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ کون اس کو اس کے اصل مقصد میں استعمال کرتا ہے، جیسا کہ صحابہ وتابعین، سلفِ صالحین اور ان کے متبعین کا معمول رہا، اور کون اس سے اپنی دنیا طلبی کا سامان پیدا کرتا ہے، جیسا کہ آج کل بعض افراد وطبقات کے ہاں یہ پہلو پایا جاتا ہے: يُضِلُّ بِهٖ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهٖ كَثِيرًا (البقرۃ ۲۶) کا ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے۔ واللہ اعلم

تیسرا اور اصل منشا ہے اِن مضامین میں غور وفکر کی دعوت دینا اور تفکر وتدبر پر ابھارنا۔ مگر اِس دعوتِ تدبر کا مقصد کیا ہے؟ یہ بھی اِس دور کا نہایت اہم اور قابلِ توجہ موضوع بن چکا ہے، اِس لیے اِس پر ذرا تفصیل سے لکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، وباللہ التوفیق۔

اللہ کی نشانیوں میں دعوتِ تدبر اور غور وفکر کا مقصد:

قرآنِ کریم میں جگہ جگہ مختلف پیرایوں میں اِنسانوں کو اللہ کی نشانیوں (آیات فی الکون) میں غور وفکر کی اور تفکر وتدبر کی دعوت دی گئی ہے:

کہیں تو اِس کارگہِ ہستی کی شیشہ گری اور اس کے اجزائے ترکیبیہ کی کاریگری کو ان کے پیدا کرنے والے اور جوڑنے والے کے وجود اور وحدانیت پر بطور دلیل کے پیش فرمایا گیا ہے، اِرشاد ہے:

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِأُولِي الْأَلْبَابِ (آل عمران ۱۹۰)

بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور لیل ونہار کی گردش [کے نظام] میں یقیناً نشانیاں ہیں عقلمندوں کے لیے۔

اور کہیں اِس کارخانۂ عالم کی تخلیق وترکیب کو بطور منّ واِحسان کے بیان فرمایا گیا ہے، اِرشاد ہے:

وَمِنْ آيَاتِهٖ أَنْ يُرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرَاتٍ وَلِيُذِيقَكُمْ مِنْ رَحْمَتِهٖ وَلِتَجْرِيَ الْفُلْكُ بِأَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (الروم ۴۶)

اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ہوائیں چلاتا ہے مژدہ سناتی، تاکہ تمھیں (اِن ہواؤں کی بدولت) اپنی رحمت کا ذائقہ دے، اور تاکہ (ان کے ذریعے) کشتیاں چلیں اسی کے حکم سے، اور تاکہ تم اس کا رزق تلاش کرسکو، اور تاکہ تم شکر ادا کرو۔

ایک اور جگہ اِرشادِ باری ہے: هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَسْمَعُونَ (یونس ۶۷)

وہ ہی ہے جس نے تمہارے واسطے رات کو بنایا تا کہ تم اس میں سکون حاصل کرو، اور دن کو بنایا (روشن) دکھلانے والا، یقیناً اِس میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو سننا (سمجھنا، اور ماننا) چاہتے ہیں۔

اِن آیات میں اور اِن کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات میں کائنات میں مستور وموجود اللہ کی نشانیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، اور اِنسانوں کو ان میں غور وفکر کی دعوت بھی دی گئی ہے۔

اِس سلسلہ کی تمام آیات میں غور کرنے سے، مخاطَب کے فرق کے لحاظ سے بحیثیتِ مجموعی غور وفکر کی دعوت کے چار مقاصد سامنے آتے ہیں:

(۱) منکر وکافر اور دہریوں پر حجت قائم کرنا۔ (۲) تلاشِ حق میں سرگرداں کو دلیلِ راہ فراہم کرنا۔ (۳) مؤمن کو تشکر وامتنان کی ترغیب دینا۔ (۴) پختہ ایمان موحد کو عین الیقین عطا کرنا۔

آئندہ سطور میں ہم اِن چاروں مقاصد سے متعلق بعض بعض آیات پیش کرتے ہیں:

مقصدِ اول: منکر وکافر اور دہریوں پر حجت قائم کرنا:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ (البقرۃ ۱۶۴)

بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں، اور رات ودن کی گردش میں، اور اُن کشتیوں میں جو سمندر میں لوگوں کے نفع کی چیزیں لے کر چلتی ہیں، اور بارش کے اس پانی میں جو اللہ نے آسمان سے نازل فرمایا پھر اس کے ذریعے زمین کو اس کے مردہ ہوجانے کے بعد زندہ فرمادیا، اور اُس میں ہر قسم کے جانور پھیلادیئے، اور ہواؤں کے بدلنے میں، اور اُس بادل میں جو آسمان اور زمین کے درمیان (حکمِ الٰہی کا) پابند ہو کر چلتا ہے؛ یقیناً نشانیاں ہیں سمجھنے والوں کے لیے۔

یعنی جب کائنات میں ہر لحہ اور ہر آن اتنے بڑے بڑے انقلابات اور تغیرات ایک خاص ترتیب اور تسلسل کے ساتھ برپا ہیں، تو یقیناً اُن کے پیچھے کوئی طاقت ہوگی جو اتنا بڑا انظام سنبھالے ہوگی، ورنہ موجد

کے بغیر از خود نہ تو کوئی چیز موجود ہو سکتی ہے، اور نہ ہی کسی ڈیوٹی اور خدمت کو انجام دے سکتی ہے۔

پھر پورے نظام کا اِس قدر حسنِ ترتیب اور سلیقہ سے مسلسل انجام پاتے رہنا یہ دلیل ہے کہ ان میں مؤثرِ حقیقی کوئی ایک ہی ذات ہے، ورنہ اگر پورے نظام کا سرچشمہ ایک ہی ہاتھ میں نہ ہوتا تو اِس خوبی اور یکسانیت کے ساتھ اتنے بڑے نظام کا بقاء اور اِستحکام ممکن نہیں تھا: لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا (الأنبیاء ۲۲)

اگر آسمان وزمین میں اللہ کے سوا اور بھی معبود ہوتے تو دونوں کا نظام درہم برہم ہوجاتا۔

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ آیتِ بالا إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ کی تفسیر کے تحت حضرت تھانویؒ کے کلام کی تلخیص کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"... اِس عقلی استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ اِن سب چیزوں کا وجود ممکن ہے، ضروری اور دائمی نہیں، کیونکہ بعض میں یہ مشاہدہ ہے کہ وہ پہلے معدوم تھیں اور پھر موجود ہوئیں، اور بعض کے احوال بدلتے رہنے سے اس کا پتہ چلتا ہے، اور بعضے مرکب ہیں جو اپنے اجزاء کی طرف محتاج ہیں، ترکیب اجزاء سے پہلے معدوم تھیں (اور یہ سب حدوث وتغیرات وغیرہ "ممکن" کے احوال میں سے ہے، نہ کہ "واجب" کے)۔

جب سب کا "ممکن" ہونا معلوم ہوگیا تو سمجھو کہ "ممکن" کا چونکہ وجود وعدم دونوں برابر ہوتے ہیں، (اِس لیے) اس کو اپنے وجود کے لیے کسی مرجح کی ضرورت ہوتی ہے، وہ مرجح اگر اسی جیسا کوئی "ممکن" ہی ہو تو اس کے لیے پھر مرجح کی ضرورت ہوگی، تو اس محال سلسلۂ لامتناہی کو قطع کرنے کے لیے ماننا پڑے گا کہ مرجحِ وجود کوئی ایسی ذات ہے جس کا وجود اصلی اور ذاتی ہو، کہ اس سے کبھی جدا نہ ہو سکتا ہو، اسی کو "واجب الوجود" اور "خدا" کہتے ہیں۔ تو یہ دلیل ہے صانعِ عالم کے "وجود" کی۔

رہا اس کا "واحد" ہونا تو اس کی تقریر یہ ہے کہ اگر نعوذ باللہ صانعِ عالم مثلاً دو ہوں، تو یا تو دونوں قادرِ مطلق ہوں گے، یا ان میں سے کوئی عاجز بھی ہوسکتا ہے، دوسری صورت تو غلط ہے، کیونکہ جو عاجز ہوگا وہ صانعِ عالم اور واجب الوجود نہیں ہوسکتا، پہلی صورت کہ دونوں قادرِ مطلق ہوں یہ بھی محال ہے، کیونکہ اس صورت میں یہ سوال ہوگا کہ اگر ان میں سے کسی نے ایک کام کا قصد کیا، مثلاً زید کو پیدا کرنے کا، تو دوسرا اُس کے خلاف کا قصد کرسکتا ہے یا نہیں؟ اگر کہو کہ خلاف کا قصد نہیں کر سکتا تو عاجز ہونا لازم آگیا، اور جو عاجز ہوگا وہ خدا کب ہوسکتا ہے! اور اگر کہو کہ خلاف کا قصد کرسکتا ہے تو اس صورت میں یا تو دونوں کا اِرادہ پورا ہوگا یا ایک کا، اگر ایک کا اِرادہ پورا ہوا، ایک کا نہ ہوا، تو دوسرا قادرِ مطلق نہ رہا، اور اگر دونوں کا اِرادہ پورا ہوگا تو ضدین کا اجتماع ہوگا کہ زید موجود بھی ہو اور معدوم بھی ہو، یہ محال ہے، اس لیے دو کا قادرِ مطلق ہونا خود محال ہوگا۔

پس قادرِ مطلق ایک ہی ہوسکتا ہے، یہی مقصود تھا (اِس آیت اور اُس کے بیان کا)، خوب سمجھ لو" (تسہیل بیان القرآن ج ۱ ص ۴۸، بتغیر یسیر)۔

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:

قرآن کریم نے توحید کا دعویٰ کیا، اسکی دلیل ﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ﴾ الآیۃ بیان فرمائی، جس کا مطلب یہ ہے کہ اِس کائنات میں بھی توحید کے دلائل ہیں، تو اِس کائنات میں چند حیثیتیں ہیں:

اول ان کا دلیل توحید ہونا۔ دوسرے ان کے پیدا ہونے کا طریقہ۔ اور تیسرا ان کے تغیرات کے ڈھنگ۔ قرآن کریم کو صرف پہلی حیثیت سے ان سے تعلق ہے۔

اس کے بعد اگر کوئی یہ سوال کرنے لگے کہ بادل کس طرح پیدا ہوتے ہیں اور بارش کیوں کر ہوتی ہے اور اس قسم کے حالات، تو قرآن سے ان کا تلاش کرنا غلطی ہے'' (ضرورۃ العلم) اھ (مأخوذ از: تعارف وتقدیم ''بیان القرآن'' ص ۱۲، از: مفتی عبدالشکور ترمذی)۔

اِسی طرح کا مضمون قرآنِ کریم میں اور بھی مختلف جگہ وارِد ہوا ہے، ایک جگہ اِرشاد ہے: أَوَلَمْ يَنظُرُوا فِي مَلَكُوتِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللهُ مِن شَيْءٍ (الأعراف ۱۸۵)

کیا اِن لوگوں نے آسمانوں اور زمین کی سلطنت میں اور اُن چیزوں میں غور نہیں کیا جو اللہ نے بنائی ہیں۔

ایک اور جگہ فرمایا: وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ، وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ (الذاریات ۲۰-۲۱)

اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لیے، اور تمہاری اپنی جانوں میں بھی، تو کیا تم دیکھتے نہیں!۔

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:

تمام عالَم میں اُن کا تصرف ہے، اور وہ خود نظر نہیں آتے، گو یہ سب تصرفات اُنہی کے ہیں، رازق نظر نہیں آتا رزق نظر آتا ہے۔ اِس سے یہ دَہریے سمجھے کوئی ہے ہی نہیں۔ اِن فلاسفہ اور دہریوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چیونٹی لکھے ہوئے کاغذ پر چلی، اُس پر حروف لکھے دیکھ کر کہنے لگی: کیسے اچھے حروف بن رہے ہیں! دوسری چیونٹی نے کہا کہ یہ خود بخود نہیں بنے، بلکہ یہ قلم نے بنائے ہیں، تیسری نے کہا کہ قلم کیا بناتا، وہ قلم جس کے ہاتھ میں ہے اُس نے بنائے ہیں، چوتھی نے کہا: ہاتھ کیا بناتا، جس نے ہاتھ بنایا سب اُس کا کمال ہے۔ غرض ایک حقیقت پر پہنچ گئی، باقی سب وسائط میں اُلجھے ہوئے ہیں، اور حقیقت سے بے خبر ہیں''۔ (ملفوظات حکیم الامت ۴/ ۲۱۱، ۲۱۲)۔

ایک اور جگہ اِرشاد فرماتے ہیں:

''اِس پر کسی دلیل کے قائم کرنے کی ضرورت نہیں، فطرت خود بتلا رہی ہے کہ کوئی پیدا کرنے والا ضرور موجود ہے، میں نے ایک دہریہ ملحد کا قول دیکھا ہے جو بعد میں صانع کا قائل ہو گیا

تھا کہ جس زمانے میں صانع کے اِنکار پر لکچر دیا کرتا تھا، تو میرا ضمیر میری تکذیب کرتا تھا، فرمایا کہ صانع کی دلیل تو خود صانع ہی ہے بقول مولانا (رومیؒ):

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب — گر دَلیلت بایداَزوَے رُومتاب

(آفتاب خود ہی اپنے وجود پر دلیل ہے، پھر بھی اگر تم کو وجودِ آفتاب کی دلیل کی ضرورت ہے تو اس سے رخ مت پھیرو، تھوڑی دیر میں خود ہی سمجھ میں آجائے گا)

(ملفوظاتِ حکیم الامت، ۱۵۶/۳)

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا:

عقلائے یورپ موجد ہیں ایسے مصانع کے جن کی ایجادوں سے حیرت ہوتی ہے، مگر ایسے صریح مغالطہ میں پڑے ہوئے ہیں کہ نہایت درجہ قابل حیرت ہے! جس قدر عقلمندی میں اعلیٰ درجہ رکھتے ہیں اُسی قدر اُن میں دہریت ہے، اور خدا کے منکر ہیں، دنیا میں تو کوئی فعل بلا فاعل کے نہ ہو سکے اور اتنے بڑے عالَم کے لیے صانع کی ضرورت تسلیم نہیں کرتے! یہ قدرتِ خدا کا نظارہ ہے (ملفوظات حکم الامت ۲۰ حسن العزیز ۳۴۲/۴)۔

[اقتباساتِ بالا بحوالہ حواشی "الانتباہات المفیدہ" از: حکیم فخرالاسلام صاحب مظاہری زیدمجدہ]

اِسی لیے اللہ تعالیٰ نے ایک موقع پر اِسی طرح کے کائناتی حقائق اور دلائل بیان کرنے کے بعد فرمایا: فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ (الأعراف ۱۸۵)

تو اَب اِس کے بعد کس بات پر یہ لوگ ایمان لائیں گے؟!۔

ایک جگہ فرمایا: تِلْكَ آيَاتُ اللهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَ اللهِ وَآيَاتِهِ يُؤْمِنُونَ (الجاثیۃ ۶)

یہ اللہ کی نشانیاں ہیں جن کو ہم آپ کے سامنے بالکل ٹھیک پڑھ کر سناتے ہیں، تو اَب یہ لوگ اللہ اور اس کی نشانیوں کے بعد کس بات پر ایمان لائیں گے؟!۔

اِن اِرشادات سے کافروں اور دہریوں کے لیے تدبرِ آیات کے مقصد کی تعیین واضح طور پر ہوجاتی ہے کہ ان مخلوقات میں غور کر کے ان کے خالق کی تلاش کرنی چاہیے، مصنوعات میں غور کر کے صانع کی جستجو میں لگنا چاہیے، اور اس کارخانۂ قدرت کے عجائب ولطائف، اور اِس عالمِ رنگ وبُو کے حسنِ عالم تاب میں غور کر کے، اس کے پیچھے موجود اُس کارسازِ حقیقی تک پہنچنے کی کوشش کرنا چاہیے کہ دنیا کی یہ تمام نیرنگیاں اور رنگینیاں جس کی ایک ادنیٰ تجلی کی کرشمہ سازیاں ہیں، اور اگر اتنے کھلے ہوئے حقائق اور دلائل کے بعد بھی اِیمان نہیں لاتے اور حق کو قبول نہیں کرتے تو پھر وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ کی وعید موجود ہے۔ (جاری)

علمی تحقیق

گذشتہ سے پیوستہ

کیا قرآنِ کریم میں سائنس کی تعلیم بھی ہے؟

مولانا محمد معاویہ سعدی

استاذ شعبۂ تخصص فی الحدیث مظاہر علوم سہارنپور

اللہ کی نشانیوں میں غور وفکر کا دوسرا مقصد۔

آیات اللہ فی الکون (کائنات میں موجود ومستور اللہ کی نشانیوں) میں غور وفکر کا دوسرا (بلکہ اصل ترتیب کے لحاظ سے پہلا) اور اہم ترین مقصد: تلاشِ حق میں سرگرداں شخص کو دلیلِ راہ فراہم کرنا ہے۔

لہٰذا جو شخص حق کی تلاش میں ہے، اور اپنے خالقِ حقیقی اور مالکِ اصلی کو جاننا اور پہچاننا چاہتا ہے تو اُس کو چاہیے کہ موجوداتِ عالم میں غور کر کے اُن کے موجد تک، مصنوعاتِ عالم میں غور کر کے اُن کے صانع تک، اور مخلوقاتِ عالم میں غور کر کے اُن کے خالق تک پہنچنے کی کوشش کرے، جس کا نمونہ سیدنا حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام کی سیرت سے ملتا ہے کہ آپ نے نبوت سے پہلے آسمان وزمین کی نشانی، لیل ونہار کی گردش اور شمس وقمر کے سلسلۂ طلوع وغروب میں اِسی پہلو سے غور فرمایا تھا، پھر آخر میں پکار اٹھے تھے: إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ[الأنعام ۷۹]

میں نے اپنا رخ اُس ذات کی طرف کرلیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا؛ اِس حال میں کہ میں باطل سے اِعراض کرنے والا ہوں، اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

اور اسی حیثیت سے عرب کے ایک دیہاتی کا یہ استدلال بھی مشہور ہے: ”البعرة تدل على البعير، والروث على الحمير، وآثار الأقدام على المسير، فسماء ذات أبراج، وأرض ذات فجاج، وبحار ذات أمواج، ألا تدل على الصانع اللطيف الخبير؟“ [تفسیر الرازی ۲/۳۳۴، والتقریر والتحبیر ۳/۳۴۳]

راستوں میں پڑی ہوئی اونٹ کی مینگنی بتاتی ہے کہ اِدھر سے اونٹ گذرے ہیں، لید بتاتی ہے کہ (گھوڑے اور) گدھے گذرے ہیں، نشاناتِ قدم بتاتے ہیں کہ لوگ گذرے ہیں، تو کیا یہ برجوں والا آسمان، اور یہ پیچ در پیچ راستوں والی زمین، اور یہ موجوں سے کھیلتے سمندر نہیں بتا رہے ہیں کہ اُنھیں کسی ایسے صنعت گر نے پیدا کیا ہے جو پسِ پردہ ہے، اور اپنے فن اور صنعت سے خوب باخبر ہے؟!۔

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں :

صانع کی ہستی کا قائل ہونا فطری اَمر ہے، اِسی واسطے اِمام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ اِس پر ہر شخص سے سوال ہوگا'' (ملفوظات حکیم الامت ج ۲۶، الکلام الحسن ص ۲۳۲)۔

اور قرآن میں مذکور ''آیات اللہ فی الکون'' (اللہ کی اِن نشانیوں) کا یہ مقصد آج کل ایسا کھل کر سامنے آرہا ہے کہ پوری دنیا میں اِس وقت ایک عجیب ایمانی وروحانی ہلچل مچی ہوئی ہے، شاید ہر روز ہی کوئی نہ کوئی حق کوش غور وفکر اور تدبرِ کائنات کے اِسی راستے سے داخلِ اسلام ہورہا ہے، اور اللہ کے وجود، وحدانیت اور حاکمیت پر ایمان سے سرفراز ہورہا ہے، اور موجودہ دور کی حریت پسندی اور آزادیٔ رائے کے شر سے نکلنے والا یہ وہ خیر ہے جس کے انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔

میرے سامنے اِس موضوع سے متعلق اِس وقت انٹرنیٹ پر موجود روزنامہ ''جنگ'' کی ایک آٹھ سالہ پرانی اور نہایت لمبی رپورٹ ہے، جس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں :

گذشتہ چند سالوں میں اسلام دنیا میں تیزی سے پھیلنے والا مذہب بن چکا ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق ۱۹۹۰ء سے ۲۰۰۰ء کے دوران ایک کروڑ ۲۵ لاکھ سے زائد افراد اپنا مذہب ترک کرکے اسلام قبول کرچکے ہیں، جب کہ ۲۰۰۱ء میں نائن الیون واقعہ کے بعد امریکہ سمیت دنیا بھر میں مسلمانوں کی تعداد دوگنی ہوچکی ہے، اور قرآن پاک دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب بن چکی ہے۔

اس کے بعد اخبار نے پچیسوں نام زد اہم عالمی اور مؤثر شخصیات کے قبولِ اسلام کے تازہ واقعات کے حوالے دیئے ہیں، اور آخر میں مغربی ممالک میں اسلام کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے متعلق مصدقہ تفصیلی رپورٹ پیش کی ہے۔

اِسی طرح ''فکر وخبر'' نامی آن لائن میگزین کے آج کے مرکزی صفحہ پر موجود مضمون کی شاہ سرخی یہ ہے : ''برطانیہ میں سب سے تیزی سے پھیلنے والا مذہب اسلام''۔ آگے کا اقتباس یہ ہے:

دوسرے لفظوں میں فی الحال برطانیہ میں اسلام کی بادِ بہاری چل رہی ہے اور اس کی تازگی، خنکی اور خوشبو کا احساس ہر کسی کو ہورہا ہے۔ پیغام توحید ورسالت مغربی افکار واقدار کے تار وپود بکھیر رہا ہے اور حق وصداقت کی کرنیں اہل کلیسا کے دل ودماغ کو روشن کررہی ہیں، برطانوی حکومت کے جاری کردہ اَعداد وشمار اور مختلف تحقیقات کے نتیجے ظاہر کرتے ہیں کہ یہاں اسلام پسندوں کی تعداد میں اضافہ ہورہا ہے اور عیسائیوں کی تعداد گھٹ رہی ہے۔ مسجدیں آباد ہورہی ہیں اور چرچ ویران ہورہے ہیں۔ نئی نئی مسجدیں خوب تعمیر ہورہی ہیں یا پرانی عمارتوں کو خرید کر مسجد میں تبدیل کیا جارہا ہے، دوسری طرف عیسائیوں کی عدم توجہی کے سبب گرجا گھروں کو بند کیا جارہا

ہے۔ کئی جگہ تو یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ گرجا گھروں کے مالکان نے انھیں مسلمانوں کے ہاتھوں فروخت کر دیا کہ وہ اسے مسجد بنالیں۔ یہ صورت حال جہاں عیسائیت کے خیر خواہوں کے لئے فکر کا سبب ہے وہیں اسلامی داعیوں کے لئے باعث مسرت ہے۔ اس سے مغربی شہریوں کا مذہب کے تعلق سے مثبت رویہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک طرف جہاں اسلام کی مخالفت ہوتی ہے وہیں دوسری طرف اس کے بارے میں عوام اچھے خیالات بھی رکھتے ہیں..... دوسرے الفاظ میں اسلام برطانیہ کا دوسرا سب سے بڑا مذہب بن چکا ہے''۔

مذکورہ اخبار کی رپورٹ کہتی ہے :

یوروپ میں جہاں ایک طرف مسلمانوں کے لیے کچھ چیلنج ہیں تو دوسری طرف ایک بڑا طبقہ ان کا بانہیں کھول کر استقبال بھی کرتا ہے۔ یہاں عیسائیت کے لئے جو مایوس کن صورتِ حال ہے وہی اسلام کے لئے خوش آئند بھی ہے۔ یہاں بیشتر لوگ مذہب میں دلچسپی نہیں لیتے اور برائے نام عیسائی ہیں، مگر جیسے ہی وہ اسلام اور قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں انھیں تازگی کا احساس ہوتا ہے اور اسے قبول کر کے وہ روحانی سکون محسوس کرتے ہیں۔ یہاں اسلام کی اشاعت میں روایتی مسلمانوں کا کوئی اہم رول نہیں ہے، بلکہ یہ اسلام کی اپنی کشش ہے کہ لوگ اس سے متاثر ہو رہے ہیں۔ خود نومسلم اسلام کی تبلیغ کا کام کرتے ہیں اور دوسروں کو اسلام کے قریب لاتے ہیں۔ خود مخالفین کی کوششیں بھی اسلام کے فروغ کا باعث بنتی ہیں جسے قرآن کی زبان میں کہا جائے تو اللہ تعالیٰ شر میں بھی خیر کا پہلو نکال دیتا ہے''۔ اھ

سچ کہا ہے علامہ اقبالؒ نے:

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں		اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے، اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے

خلاصہ یہ کہ سائنسی تحقیقات کے اِس دورِ عروج میں قرآن کا یہ مقصد ایک عجیب معجزانہ شان سے پورا ہو رہا ہے، کہ کوئی آفاق کی بے پناہ وسعتوں اور پہنائیوں میں غور کر کے اُن میں موجود اللہ کی نشانیوں پر حیرت زدہ ہو رہا ہے، اور بے ساختہ ''اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُو'' کا کلمہ پڑھ رہا ہے، اور کوئی اَنفُس (انسانی وجود) میں (خلیات، جینیات اور دیگر مظاہرِ حیات کی شکل میں) موجود قدرت کے کمالات اور عجائبات میں غور کر کے برجستہ ''فَتَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ'' کا نعرہ بلند کر رہا ہے، اور یہ تقریباً ہر روز ہی کا قصہ ہے۔

قرآن نے اللہ کی نشانیوں کو بیان بھی اِسی لیے کیا ہے کہ اُن کے ذریعے اللہ کو پہچانا جائے، اور اُس کی ذات وصفات کی معرفت حاصل کی جائے، اور ذات وصفات کی معرفت کے نتیجے میں اُس کی خالقیت، ربوبیت، حاکمیت، قدرت، اور کمالِ علم وحکمت کو تسلیم کیا جائے، اور نتیجتاً اُس کے تشریعی اَحکام اور تقدیری فیصلوں کو دِل وجان سے قبول کیا جائے۔

اللہ کی نشانیوں میں غور وفکر کا تیسرا مقصد۔

نظامِ کائنات میں غور وفکر کرنے والا اگر پہلے ہی سے موحد اور پختہ مسلمان ہے تو اُس کے لیے غور وفکر کے بنیادی طور پر تین مقاصد ہو سکتے ہیں:

''تذکیر بآلاء اللہ'' : یعنی کائنات میں جو کچھ اللہ نے بندوں کے نفع کے لیے پیدا کیا ہے اُن میں غور وفکر کرکے، اللہ کے اِنعامات و اِحسانات کو پہچاننا، اور تشکر و امتنان کا اِظہار کرنا۔

شکر گذاری کا یہ جذبہ اور یہ طریقہ تمام انبیاء، صحابہ، اولیاء اور سلفِ صالحین کا طریقہ اور وظیفہ رہا ہے، سیدنا حضرت سلیمانؑ کے قصے میں اُن کی مانگی ہوئی یہ دعا ذکر کی گئی ہے: رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَدْخِلْنِي بِرَحْمَتِكَ فِي عِبَادِكَ الصَّالِحِينَ [النمل ۱۹]

اے میرے پروردگار! مجھے توفیق دے کہ میں شکر بجالاؤں تیری اُن نعمتوں کا بھی جو تونے مجھ پر کیں، اور اُن کا بھی جو تونے میرے والدین پر کیں، اور اِس کی توفیق بھی دے کہ میں ایسا نیک عمل کروں جس سے تو راضی ہو جائے، اور مجھے اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں داخل فرمالے۔

اپنے اوپر جاری اللہ کی نعمتوں پر اِس طرح بھی غور کیا جاسکتا ہے کہ مثلاً اللہ نے ہم کو مخلوقات میں سے اِنسان یعنی اشرف المخلوقات بنایا، پھر چوں کہ عام اِنسان بھی پستی اور گھاٹے میں ہیں، مگر وہ ہی جو اِیمان لائے اور اَعمالِ صالحہ کی توفیق سے نوازے گئے، تو اللہ تعالیٰ نے اِنسانوں میں سے ہم کو اُس فریق میں سے بنایا جس کو اِیمان کے ذریعے سربلندی عطا کی گئی، اور نیک اعمال کے ذریعے عزت دی گئی، پھر علمِ دین کے ذریعے رفعتوں سے نوازا گیا...، پھر ایسے والدین دیئے جو ہمارے دین اور علم کا ذریعہ بنے...

یا اِس طرح کہ میں تو ایک ناپاک قطرۂ منی (نطفہ) تھا، پھر کس طرح اللہ نے مجھے علقہ، مضغہ، عظام، اور جنین کے مرحلے سے گذارتے ہوئے ایک مکمل وجود بخشا، پھر جب میں ہر طرح سے لاچار اور بے بس تھا تو کس طرح میری پرورش کے لیے والدین، بھائی بہن، خاندان اور ہمدردوں کا ساتھ اور سایہ عطا فرمایا، پھر جب میں بالکل ناواقف اور جاہل تھا تو کس طرح والدین، اساتذہ، معلم و مربی، اور پیر و مرشد کے ذریعے میری تعلیم و تربیت کا انتظام فرمایا... وغیرہ وغیرہ۔

یا اِس طرح کہ ہماری ضرورتوں کی تکمیل، اور راحت و آسائش کے اسباب کے طور پر اللہ تعالیٰ نے کیسی کیسی نعمتیں عطا فرمائی ہیں: پینے کو پانی، کھانے کو غلہ و اناج، پھل اور سبزی، گوشت اور مچھلی، میوے اور

فوائد، جینے کو ہوا، دیکھنے کو روشنی، رہنے کو زمین کا فرش اور آسمان کی چھت، جاگنے کو دن، سونے کو رات، ماہ وسال کی ترتیب اور موسم کے تغیرات کے لیے سورج، چاند اور تارے...، سواری کے لیے اور دیگر بہت سے فائدوں کے لیے جانور...، پھر یہ خشکی وتری کا نظام، جھیل ودریا، ندی ونالے، سمندر اور پہاڑ... وغیرہ وغیرہ۔

اِس کے علاوہ بیوی بچوں اور آل اولاد کی نعمت، مال واَسباب کی نعمت، صحت کی نعمت، فراغِ وقت کی نعمت، ذہنی سکون اور قلبی یکسوئی کی نعمت، پیدائش سے لے کر موت تک کے مختلف مراحلِ حیات میں عطا ہونے والی بے شمار نعمتیں، صبح سے شام اور شام سے صبح تک نازل ہونے والی بے حد وحساب نعمتیں: سب ہی کا بقدرِ اِمکان اِدراک اور اِستحضار کرنا، اور اُس پر مُنعمِ حقیقی تبارک وتعالیٰ کا شکر گذار رہنا، اور **وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللهِ لَا تُحْصُوهَا** [النحل ۱۸] کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، یہ دعا مانگتے رہنا: "**اللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا شَاكِرِينَ لِنِعْمَتِكَ، مُثْنِينَ بِهَا، قَابِلِيهَا وَأَتِمَّهَا عَلَيْنَا**" [ابوداود ۹۶۹]

پروردگار! ہمیں اپنی نعمتوں کا شکر گذار بنا، اُن پر تیری حمد وثنا کرنے والا بنا، اُن کو دِل سے قبول کرنے والا بنا، اور اُن نعمتوں کی ہم پر تکمیل فرمادے۔

یہ ایک طویل دعا کا آخری ٹکڑا ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ (پوری) دعا ہم لوگوں کو نہایت اہتمام سے سکھاتے تھے۔

بلکہ بعض خاص خاص نعمتوں کے حصول پر مستقل شکر کے الفاظ بھی سکھائے گئے ہیں، جیسے کھانے کے بعد کی دعا، پینے کے بعد کی دعا، دسترخوان اٹھائے جانے کی دعا، افطار کے وقت کی دعا، بستر پر پہنچنے کی دعا، سوکر اٹھنے کی دعا، استنجے سے فراغت کے بعد کی دعا، نئے کپڑے پہننے کی دعا، صبح وشام کے دخول وخروج کی دعا، چھینک آنے پر دعا، دوسرے کی مصیبت کے مقابلے میں اپنی عافیت کے اِستحضار کی دعا، روزہ کی تکمیل کی دعا، سواری پر سوار ہونے کی دعا، سفر سے واپس آنے کی دعا، نیا چاند دیکھنے کی دعا؛ کہ اِن مواقع پر جو دعائیں سکھلائی گئی ہیں وہ سب "الحمدللہ" (تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں) کے الفاظ سے شروع ہوتی ہیں، اور "الحمد" کو "رأس الشکر" کہا گیا ہے۔

ایک حدیث میں یہ مضمون وارِد ہوا ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی خوش گوار چیز دیکھتے تو "الحمد لله الذي بنعمته تتم الصالحات" پڑھتے، اور جب کوئی ناگوار معاملہ پیش آتا تو "الحمد لله على كل حال" پڑھتے [عمل الیوم واللیلۃ لابن السنی ۳۷۸]۔

ایک اور حدیث شریف میں ہے: اللہ تعالیٰ بندے کو کوئی نعمت عطا فرمائیں اور وہ اُس پر "الحمدلله رب العالمين" پڑھ لے تو اللہ تعالیٰ اُس کو اُس سے اور بہتر بھی عطا فرماتے ہیں (ایضاً)۔

اور یہ مضمون تو قرآنِ کریم میں بھی موجود ہے: {لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ}[ابراہیم ۷]۔

ایک سچے مسلمان کو ہر ہر موقع کی یہ دعائیں یاد ہونی چاہییں، اور حتی الامکان اُن کا معمول بھی بنانا چاہیے، کہ یہ ہم پر اللہ کا حق ہے۔ شریف لوگ اپنے اوپر اِحسان کرنے والے کو ہمیشہ یاد رکھتے ہیں، اور جو ذات کہ ہمہ وقت ہمارے اوپر اِحسان فرما رہی ہے اُس کو ایک شریف اور بامروت انسان کیسے بھول سکتا ہے؟! : شکرِ نعمتہائے تو چنداں کہ نعمتہائے تو

پھر کچھ لوگ حریص اور لالچی ہوتے ہیں، اُن کو مزید کی ہوس ہوتی ہے، اور طبیعت میں غفلت اور غباوت بھی ہوتی ہے، کہ خود سے نعمتوں کی طرف توجہ نہیں ہوتی، اور محسن کی یاد بھی نہیں آتی، اِس لیے اللہ نے یہ دعائیں بتلا کر اِن پر مزید ثواب اور فضائل کا وعدہ بھی فرمالیا، تاکہ ایسے پست طبیعت لوگ بھی محروم نہ ہوں، یہ اُس کا کرم بالائے کرم ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي هَدَانَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْ لَا أَنْ هَدَانَا اللّٰهُ[الأعراف ۴۳]۔

یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ تشکر وامتنان کا یہ جذبہ پیدا کرنے کے لیے نعمتوں کا اِستحضار ضروری ہے، اُن کے اَسباب کی تلاش اور اُن کی علتوں کی تحقیق نہیں۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:

..... کیا خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی تحقیقاتِ مصالح کے لیے تم کو ملے ہیں؟ اور اگر دونوں موقعوں (قانونِ دنیا اور قانونِ شریعت) میں کوئی فرق ہو تو بتلائیے! اور فرق نہیں تو پھر یہاں ''کیوں'' اور ''کیسے'' کیوں ہے؟ (اور وہاں کیوں نہیں؟!)، بلکہ خدا تعالیٰ محبوب بھی ہیں اور حاکم بھی، تو یہاں بدرجۂ اَولیٰ یہ حالت ہونی چاہیے کہ:

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی رضائے تو

اگر آپ زندہ رکھتے ہیں تو یہ آپ کی عطا ہے، ورنہ اگر مار بھی ڈالیں جب بھی ہم راضی ہیں

جاں شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

جب دل آپ کا عاشق ہو گیا پھر آپ کچھ بھی کریں ہم راضی ہیں۔

زباں تازہ کردن باقرارِ تو نینگیختن علت از کارِ تو

ہمیں تو آپ کی ربوبیت اور حاکمیت کے اقرار سے زبان تازہ رکھنی ہے، نہ کہ آپ کے کاموں کی کُنہ میں ہمیں پڑنا ہے۔ (وعظ فوائد الصحبۃ: ص ۲۶) (جاری)

علمی تحقیق گذشتہ سے پیوستہ

کیا قرآنِ کریم میں سائنس کی تعلیم بھی ہے؟

مولانا محمد معاویہ سعدی
استاذ شعبۂ تخصص فی الحدیث مظاہر علوم سہارنپور

ب : ’’تذکیر بأیام اللہ‘‘: نظامِ کائنات میں غور وفکر کرنے والا اگر موحد اور پختہ مسلمان ہے تو اُس کے لیے قرآن میں مذکور ’’آیات اللہ‘‘ (اللہ کی نشانیوں) میں غور وفکر کے تین مقاصد میں سے دوسرا مقصد ہوگا: ’’تذکیر بأیام اللہ‘‘۔

یعنی گذشتہ اُمتوں کے ساتھ اللہ نے اِنعام واِکرام، یا عقاب وعذاب کے جو معاملات فرمائے ہیں اُن واقعات اور اُن کے باطنی اور تشریعی اَسباب میں غور کرکے، اُن سے عبرت ونصیحت حاصل کرنا، پھر اہلِ نعمت کے طریقوں کو اِختیار کرنا، اور اہلِ نِقمت (عذاب) کے عمل، طرزِ عمل اور اُن کے راستوں سے خود کو بچانا۔

واضح رہے کہ اہلِ اِیمان کا طریقہ تو یہ ہے کہ وہ ہمیشہ گذشتہ قوموں کی ترقی یا تنزلی کے باطنی اور تشریعی اَسباب میں ہی غور کرتے ہیں، اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ہمارے ظاہری اَحوال، دراَصل ہمارے باطنی اَحوال واَعمال کے مظاہر اور عکاس ہوتے ہیں، اگر باطن (اِیمان واَعمالِ صالحہ کے ذریعے) درست ہے تو اللہ تعالیٰ اُسی لحاظ سے ظاہری اَحوال مرتب فرماتے ہیں، عقلیں کھول دیتے ہیں، جس کے نتیجے میں صحیح اَسباب اِختیار کیے جاتے ہیں، اور فیصلے درست ہونے لگتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا اِرشاد ہے: وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَى آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكَاتٍ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَلَكِنْ كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُمْ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ [الأعراف ۹۶]

> اور اگر بستیوں والے اِیمان لاتے اور تقویٰ اِختیار کرتے تو ہم اُن پر آسمان وزمین سے برکات — کے دروازے — کھول دیتے، لیکن اُنھوں نے جھٹلایا، تو ہم نے اُن کی پکڑ کرلی اُن کے کرتوتوں کی بنا پر)۔

ایک اور جگہ اللہ نے فرمایا ہے: وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ

لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ[النور ۵۵]

اللہ نے وعدہ کیا ہے تم میں سے اُن لوگوں سے جو ایمان لائے اور اعمالِ صالحہ کیا کہ اُن کو زمین میں خلافت عطا فرمائیں گے جیسا کہ اُن سے پہلوں کو خلافت عطا کی تھی۔

اِنہی باطنی اور تشریعی احوال و اعمال کے تناظر میں اللہ کی خاص نصرت اور رحمت کے طور پر، عادۃ اللہ سے مافوق، اور اسباب سے ماوراء معجزات و کرامات اور آیاتِ بینات کا بھی ظہور ہوتا ہے، جس میں کہیں آگ گلزار بن جاتی ہے، کہیں پانی راستہ بن جاتا ہے، کہیں ہوا سواری بن جاتی ہے، کہیں مردے زندہ ہوجاتے ہیں، کہیں چاند کے دو ٹکڑے ہوجاتے ہیں، اور کہیں چھوٹی سی بے سروسامان جماعتیں اپنے سے کئی گنا بڑی بڑی طاقتوں کو شکستِ فاش دے کر، اُن کے غرور کو پاش پاش کر دیتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا یہ اِرشاد کچھ اِسی پس منظر میں ہے: إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ وَعَلَى اللهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ[آل عمران ۱۶۰]

اگر اللہ تمھاری نصرت کردے تو کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا، اور اگر وہ تمھیں چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو تمھاری مدد کرے، اور ایمان والوں کو چاہیے کہ اللہ ہی پر بھروسہ رکھیں)۔

اِسی طرح یہ اِرشاد بھی ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَنْصُرُوا اللهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ

اے ایمان والو! اگر تم اللہ کا ساتھ دو گے تو اللہ بھی تمھاری مدد کریں گے اور — دشمن کے بالمقابل — تمھارے قدم جما دیں گے۔

تشریعی اعمال و باطنی احوال کی تاثیر کا ہی وہ مضمون بھی ہے جو قرآنِ کریم میں فَانْظُرُوا، فَانْظُرُوا کہہ کہہ کر، مختلف انداز میں بار بار بیان فرمایا گیا ہے، مثلاً ایک جگہ اِرشاد ہے: قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ، هَذَا بَيَانٌ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةٌ لِلْمُتَّقِينَ[آل عمران ۱۳۷-۱۳۸]

تم سے پہلے بہت سے دور گذر چکے ہیں، سو زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا؟ یہ (عام) لوگوں کے لیے کھلی ہوئی (تنبیہ اور) وضاحت ہے، اور اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے سامانِ ہدایت اور نصیحت ہے۔

ایک اور جگہ اِرشاد ہے: وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ أُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ[الحشر ۱۹]

اور (اے ایمان والو!) اُن لوگوں کی طرح نہ ہوجانا جو اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے اُن کو اُن کی اپنی ذات سے بھی غافل کردیا (کہ وہ آئندہ کے لیے اور آخرت کے لیے اُس کی کچھ فکر نہیں کرپاتے)، یہی ہیں وہ لوگ جو نافرمان ہیں۔

یہ باطنی و تشریعی اَسباب اور ان پر مرتب ہونے والے اثرات کا یہ نظام ہمیشہ کے لیے ہے، جس کے بارے میں اللہ نے خود فرمایا ہے: سُنَّةَ اللهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللهِ تَبْدِيلًا [الاحزاب ۶۲ :]

یہی اللہ کا دستور اور قانون رہا ہے گذشتہ اُمتوں میں، اور آپ اللہ کے قانون میں کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے۔

اِس کے برخلاف مادّی اَسباب کی تاثیر اَفراد اور زمانے کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے، ضروری نہیں ہے کہ جو دَوا ایک مریض کے لیے مفید ہو وہی دوسرے کے لیے بھی مفید ہوجائے، جو تدبیر ایک موقع پر کارگر ہو وہی دوسرے موقع پر بھی مؤثر ہوجائے، تو مادّہ پرست طبقات کی یہ عجیب دانش مندی ہے کہ اَصل، اور لازوال وسدا بہار علاج اور تدبیر کو تو بالکل ہی نظر انداز کردیا جائے، اور وقتی وظاہری اَسباب پر ایسا تکیہ اور بھروسہ کرلیا جائے کہ اُن کی پرستش کی بُو آنے لگے!۔

ج : ''حکمت اور علت کی تحقیق'': ایک پختہ فکر مسلمان کے لیے نظامِ کائنات میں غور وفکر کا تیسرا مقصد ''حکمت اور علت کی تحقیق'' بھی ہوسکتا ہے۔

یعنی صرف عین الیقین (مشاہدے) کے حصول اور ذوقِ تحقیق کی تسکین کے لیے، کائنات کے کسی وقوعے کے سربستہ رازوں تک رسائی کی کوشش کرنا، اور قضا وقدر کے فیصلوں پر دِل سے راضی رہتے ہوئے، اُس کا ظاہری سبب تلاش کرنے کی سعی کرنا۔

جیسا کہ اُسوۂ اِبراہیمی سے اِس کا ثبوت ملتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلَىٰ وَلَٰكِنْ لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِي [البقرة ۲۶۰]

اور اُس وقت کے واقعے کو یاد کرو جب کہ اِبراہیمؑ نے حق تعالیٰ سے عرض کیا: اے میرے پروردگار! آپ مجھ کو یہ دکھلا دیجیے کہ (آپ قیامت میں مثلاً) مردوں کو کس طرح زندہ کریں گے؟ اللہ نے فرمایا: کیا تم کو یقین نہیں ہے؟ عرض کیا: کیوں نہیں؟ لیکن صرف اِس واسطے چاہتا ہوں تاکہ (کیفیتِ اِحیا کی مختلف ممکنہ صورتوں میں سے، مشاہدہ کے ذریعے کسی ایک پر) دِل کو تسلی (اور ٹھہراؤ) ہوجائے۔

اُسوۂ ابراہیمی کے اتباع میں اگر افرادِ اُمت میں سے بھی کسی کو مادّیت اور تکلف میں پڑے بغیر، اسرار وحِکَم کے یہ علوم وہبی طور پر حاصل ہوجائیں تو یقیناً یہ قابلِ تعریف اور قابلِ رشک وصف ہے، جیسا کہ حکمائے اِسلام، فقہائے کرام اور صوفیائے عظام کے ہاں اس کی بکثرت مثالیں ہیں۔

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں :

”... میں یہ نہیں کہتا کہ اَحکامِ شرعیہ میں حکمتیں نہیں ہیں، حکمتیں ضرور ہیں، مگر اول تو ہم کو ان کا اِحاطہ نہیں، دوسرے یہ کہ اُن کے اِدراک کا طریقہ یہ نہیں جو (آج کل ریسرچ اور تحقیق کے ذریعے) اِختیار کیا گیا ہے، بلکہ وہ محض موہوب ہیں، جن کا اکثر ترتب تقویٰ پر ہوا ہے۔

ذرا تاریخ میں دیکھیے کہ اُمت میں جو بڑے بڑے لوگ جیسے شاہ ولی اللہ، ابن العربی، عبد الکریم جیلی رحمہم اللہ وغیرہ گذرے ہیں اور اُنھوں نے حِکَم واسرار؛ شریعت کے لکھے ہیں، تو کیا اُنھوں نے ان اَسرار کو کسی مدرسہ میں سیکھا تھا، یا کسی مناظرہ سے حاصل کیا تھا؟ ہرگز نہیں! مگر یہ بات اِختیار کی تھی کہ مدرسہ سے نکل کر علم پر عمل کرنا شروع کردیا، خلوص اِختیار کیا، اس سے ان کے قلب میں ایک نور پیدا ہوا، جس کی بدولت اُن کو سب کچھ منکشف ہوگیا، اسی کو کہتے ہیں:

بینی اندر خود علوم انبیاء		بے کتاب وبے معید واُوستا

بغیر کتاب، اُستاد اور یاد کرانے والے کے، اپنے اندر انبیاء کے علوم محسوس کروگے۔

(فوائد الصحبۃ ص ۲۴ :)

حکیم الامتؒ کا ایک اِرشاد یہ بھی ہے کہ:

”میرے پاس اگر کوئی دو برس رہے تو میں اِن شاء اللہ تعالیٰ ثابت کردوں گا کہ ہر حُکمِ شریعت میں حِکَمِ عقلیہ (عقلی مصلحتیں بھی) ہیں، مگر (بات یہ ہے کہ) ہم ان کو علومِ عظیمہ نہیں سمجھتے، کیوں کہ وہ سب ظنی ہیں، (جب کہ اَصل علوم جو عقائد واَحکام کی معرفت پر مشتمل ہیں، اُن سب کا مبنیٰ اور سرچشمہ قطعیات ہیں)، لوگوں نے بہت سے حِکَم لکھے ہیں، اور اَب بھی اِلہام سے (منکشف) ہوتے ہیں، مگر یہ سب علوم (اور اُن کے سرچشمے) ظنی ہیں، اِس لیے علماء اس میں مشغول نہیں ہوتے (کیوں کہ اَصل مقصود تو اِیمان واِحتساب کے ساتھ نصوص اور اُصولِ شرع کا اتباع کرنا ہے، اور وہ علل ومصالح کے جاننے پر موقوف نہیں)۔

دوسرے اِس میں یہ بھی خرابی ہے کہ اگر وہ کبھی ظنیت کے سبب مخدوش ہوگئے (اور حکم بزعمِ سامع اُسی پر مبنی تھا) تو اس کے منہدم ہوجانے سے حکمِ شریعت بھی منہدم ہوجاوے گا۔ لہٰذا بیانِ اَسرار سے جواب دینا بے غبار راستہ نہیں، صاف جواب یہی دینا چاہیے کہ ہم اَسرار نہیں جانتے،

قیامت میں خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ لینا‘‘ (فوائد الصحبۃ ص ۲۸-۲۹)۔

ایک اور جگہ یہ اِرشاد ہے :

’’اِس میں تو کوئی شک نہیں کہ اصل مدار ثبوتِ اَحکامِ شرعیہ فرعیہ کا نصوصِ شرعیہ ہیں، جن کے بعد اُن کے اِمتثال اور قبول کرنے میں اُن میں کسی مصلحت وحکمت کے معلوم ہونے کا اِنتظار کرنا (کہ بغیر حکمت معلوم ہوئے نہ عمل ہو، نہ قبول کیا جائے) بالیقین حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ کے ساتھ بغاوت ہے .... لیکن اِس میں بھی شبہ نہیں کہ اُن اَحکام میں بہت سے مصالح اور اَسرار بھی ہیں کہ بعض طبائع کے لیے اُن کا معلوم ہوجانا اَحکامِ شرعیہ میں مزید اِطمینان پیدا ہونے کے لیے ایک درجہ معین ضرور ہے، گو اہلِ یقینِ راسخ کو اِس کی ضرورت نہیں .... اِسی راز کے سبب بہت سے اکابر وعلماء مثل امام غزالی وخطابی وابن عبد السلام رحمہم اللہ تعالیٰ کے کلام میں اِس قسم کے لطائف ومعانی پائے جاتے ہیں... اِلخ (ملخص از : مقدمہ ’’المصالح العقلیہ‘‘)۔

خلاصہ یہ کہ علل وحِکَم کی یہ تحقیقات: کائناتی نظام (تکوینیات) کے اَسباب وعلل اور شرعی اَحکام (تشریعیات) کے اَسرار وحِکَم کا حصہ ہیں، اِس طرح کے اُمور کا نہ تو بندہ مکلف ہے، اور نہ ہی خود یہ تحقیقات مدارِ اَحکام اور علتِ شرائع ہیں، یہ تو وہبی طور پر کسی کو اِلقا ہوجاتی ہیں، جن کو محض ذہنی بالیدگی اور تسکینِ ذوق کے لیے بیان بھی کیا جاسکتا ہے، مگر اِن کے ہونے نہ ہونے سے مسئلہ کی اصل حیثیت اور مرتبہ پر کوئی فرق نہیں پڑتا؛ اِلا یہ کہ کوئی اور دلیلِ شرعی ہی اس کی متقاضی ہوجائے۔

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں :

’’... اِس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ اَحکامِ شرعیہ میں گو مصلحت ہو؛ مگر اِطاعت اس پر موقوف نہ ہونا چاہیے، بلکہ اِطاعت محض رضا کے لیے ہو...‘‘ ۔(فوائد الصحبۃ ص ۲۴ :)

دعائے مغفرت کی درخواست

دفتر ماہنامہ کے رفیق مولانا جمیل احمد سیتاپوری کے ماموں اور حافظ محمد امین خادم مدرسہ کے سسر مولانا یعقوب مظاہری مختصر علالت کے بعد ۱۳ ربیع الاول ۱۴۴۵ھ/ ۲۹ ستمبر ۲۰۲۳ء جمعہ کے روز بعد عصر اللہ کو پیارے ہوگئے، مولانا مرحوم مظاہر علوم کے قدیم فضلاء میں سے تھے، پوری زندگی علوم دینیہ کی تدریس میں گزاری، اللہ تعالیٰ ان کی کامل مغفرت فرمائے، جنت کے اعلیٰ مقام کو ان کا مسکن بنائے، پس ماندگان کو صبر عطا فرمائے۔ تمام قارئین سے دعائے مغفرت اور ایصال ثواب کی درخواست ہے۔

علمی تحقیق

گذشتہ سے پیوستہ

کیا قرآنِ کریم میں سائنس کی تعلیم بھی ہے؟

مولانا محمد معاویہ سعدی

استاذ شعبۂ تخصص فی الحدیث مظاہر علوم سہارنپور

ایک پختہ فکر مسلمان اپنے ذوقِ تحقیق کی تسکین اور عین الیقین کی تحصیل کے لیے شرعی اَحکام ومسائل کی علتوں کی، یا کائناتی نظام کے اَسرار وحِکَم کی تحقیق کرسکتا ہے، البتہ اس کے لیے چند شرطیں ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

پہلی شرط: یہ کہ اِن اُمور کو اللہ ورسول کے اَحکام کے قبول کرنے، نہ کرنے کی کسوٹی نہ قرار دے، اور اُن کی اِطاعت کو اپنی تحقیق کے نتائج، اپنی عقل کے قبول اور مادّی فوائد کے حصول پر موقوف نہ ٹھہرائے، ورنہ یہ تو اپنی عقل، ریسرچ اور تحقیق پر اِیمان لانا ہوجائے گا، ''اِیمان بالغیب'' نہ رہ جائے گا، جو کہ اَصل مطلوب ہے۔

دوسری شرط: یہ کہ کسی بھی شرعی حکم کی تعمیل اور دینی عبادت کی ادائیگی میں اُس کے مادّی فائدے کو مقصود نہ بنائے، حتی کہ اگر کسی شرعی حکم کی بجا آوری میں طبی اور سائنسی فوائد حاصل بھی ہوتے ہوں (اور یقیناً حاصل ہوتے ہیں) جب بھی بوقتِ عمل نہ اُن کو نیت میں شامل کرے، اور نہ اُن کی طرف توجہ کرے، تاکہ آخرت کا ثواب خطرے میں نہ پڑ جائے۔

اللہ تعالیٰ کا اِرشاد ہے: مَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الآخِرَةِ نَزِدْ لَهُ فِي حَرْثِهِ، وَمَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا، وَمَا لَهُ فِي الآخِرَةِ مِنْ نَصِيبٍ [الشوری ۲۰:]

> جو کسی عمل میں آخرت کی کھیتی اور نفع کی نیت کرے گا ہم اُس کی کھیتی میں اور اِضافہ کردیں گے، اور جو دنیا کی کھیتی کی نیت کرے گا ہم (جس کو جتنا چاہیں گے دنیا میں) اُس سے نفع پہنچادیں گے لیکن پھر آخرت میں اُس کا کوئی حصہ نہ ہوگا۔

ایک حدیث قدسی میں ہے: أَنَا أَغْنَى الشُّرَكَاءِ عَنِ الشِّرْكِ، مَنْ عَمِلَ عَمَلًا أَشْرَكَ فِيهِ مَعِي

غَيْرِي، تَرَكْتُهُ وَشِرْكَهُ[صحیح مسلم ۲۹۸۵]

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میں کسی عمل میں شریک ٹھہرائے جانے والے دیگر شرکاء سے زیادہ مستغنی ہوں، جو شخص کوئی ایسا عمل کرے جس میں وہ میرے ساتھ دوسرے کا بھی حصہ لگائے — خواہ نفس کا، خواہ شیطان کا، اور خواہ دیگر مخلوقات کا — تو میں اُس کو اور اس کی شرک کی اِس حرکت کو چھوڑ کر علیحدہ اور مستغنی ہو جاتا ہوں۔

لہٰذا دین کا ہر عمل، شریعت کے ہر حکم کی پاسداری، سنتوں کی پیروی اور تابعداری؛ یہ سب صرف اور صرف ابتغاء لمرضات اللہ (اللہ کی خوشنودی کے لیے)، اُس عمل پر موعود ثواب کو پانے کے لیے، یا نہ کرنے پر مذکور عذاب سے بچنے کے لیے، اور آخرت کی سرخ روئی اور کامیابی حاصل کرنے کے لیے ہونا چاہیے، سائنسی اور طبی نقطۂ نظر سے نہیں، جبھی اُس پر موعود اجر وثواب مرتب ہوگا، ورنہ پھر معاملہ صرف دنیاوی فائدے تک ہی محدود رہ جائے گا۔

اِلا یہ کہ کوئی حکم اصلاً ہماری دنیاوی مصلحتوں ہی کے تحت دیا گیا ہو، تو ظاہر ہے کہ اُس ”اَمرِ اِرشادی“ (اور شرعی مشورے) کو اسی لحاظ سے اِختیار بھی کیا جائے گا۔

یہاں بعض لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ بعض احادیث میں بھی دینی اعمال کے دنیاوی فوائد کا تذکرہ آیا ہے، جیسے ”صُومُوا تَصِحُّوا“ (روزہ رکھا کرو صحت مند رہو گے)، اسی طرح بہت سے اعمال کی برکات میں ہر قسم کی دنیوی ضرورتوں کا پورا ہونا بھی شمار کرایا گیا ہے، ایسے ہی سورۂ واقعہ کے فوائد میں فقر وفاقہ کا پیش نہ آنا بتلایا گیا ہے..... وغیرہ وغیرہ۔

نیز بزرگانِ دین بھی دنیاوی مسائل کے حل کے لیے مختلف دینی وظائف اور اَذکار تجویز فرماتے ہیں، جن کا مقصد ہی دنیاوی غرض کا حصول ہوتا ہے۔ تو ان سب کا کیا جواب ہوگا؟

تو اِن سب کا جواب یہ ہے کہ دراَصل یہاں دو پہلو ہیں:

۱— ایک ہے کسی بھی دینی عمل کے فائدے کے لیے ماڈی سوچ اور فکر، جیسے یہ سوچنا کہ ہم جو نماز پڑھتے ہیں تو اس کے یہ یہ سائنسی فوائد ہیں، مثلاً طویل سجدے سے دورانِ خون کے ذریعے دماغ کو تازگی حاصل ہوتی ہے، رکوع اعصاب اور پٹھوں کی بہترین ورزش ہے، سلام پھیرنے میں گردن کی ورزش ہوتی ہے، وضو جلدی امراض سے حفاظت کا ذریعہ ہے، اور روزے کے یہ یہ طبی فوائد ہیں و، یا مثلاً یہ کہتے ہیں

کہ ذہنی دباؤ کے وقت خود کو بہلاؤ؛ خواہ ذِکر واَذکار کے ذریعے، یا کسی کام میں مشغول ہوکر!۔

تو اِس طرح کی سوچ، فکر اور تعبیر سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ خدانخواستہ اِن اَعمال واَشغال کا اصل مقصد اِسی طرح کے جسمانی، طبی اور مادی فوائد کا حصول ہے!!۔

حالاں کہ یہ نہایت سطحی سوچ ہے، اِس لیے کہ دِین میں تو اللہ و رسول کے لیے اپنی جان، آبرو اور مال کی قربانی پیش کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، اگر نماز سنت کے مطابق پڑھنے میں کوئی جسمانی مشقت بھی پیش آرہی ہے تو بھی ایک سچے مؤمن کو وہ گوارا کرتے ہوئے حتی الوسع نماز سنت کے مطابق ہی پڑھنی چاہیے، اگر روزہ رکھنے میں صحت پر کچھ منفی اثر بھی پڑ رہا ہے تو بھی تحمل کی حد تک مجاہدہ کرتے ہوئے روزہ رکھ ہی لینا چاہیے، اِسی طرح اللہ کے دِین کی حفاظت اور شوکت کے لیے شرعی اُصول اور تقاضوں کے مطابق جان، یا مال یا آبرو کی بازی لگانی پڑ رہی ہے تو وہ بازی لگا ہی دینی چاہیے۔

۲-- دوسرے ہے دینی اَعمال واَشغال سے متعلق روحانی اور اُخروی سوچ، جیسے کسی بھی عبادت کو اَنجام دیتے ہوئے یہ سوچنا کہ اصلاً تو اِن اَعمال کی برکت سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے، پھر جب اللہ تعالیٰ خوش ہوں گے تو اسی کے فضل سے ذہنی سکون اور قلبی اطمینان کی دولت بھی حاصل ہوگی، اور دیگر دنیوی واُخروی برکات وسعادات بھی نصیب ہوں گی۔

تو یہ تعبیر کہ نماز پڑھو تو اس کی برکت سے یہ فائدہ ہوگا، روزہ رکھو تو اس کی برکت سے یہ فائدہ ہوگا، اِسی طرح گناہ کے یہ یہ نقصانات ہیں، تو اس طرح کی تعبیر سے لوگوں کے قلوب میں اِن اعمال کی اہمیت قائم ہوتی ہے، جس سے اللہ کی عظمت اور محبت بڑھتی ہے، اور تعلق مع اللہ اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ بنتی ہے۔

نیز دینی اَعمال کے طبی ومادی فوائد اور سائنسی تحقیقات بتلانے کا ایک نقصان یہ بھی ہے کہ اگر کسی کو کسی اور ذریعے سے یہ طبی فوائد حاصل ہوسکتے ہیں تو اس کی نظر میں اِن اَعمال واَشغال کا کوئی خاص فائدہ نہیں رہ جائے گا، بالخصوص غیر مسلمین اور نومسلمین کے لیے۔

اِسی طرح اِس طرح کی تقریر سے مادّہ پرست لوگ اِسلام کو بھی صرف دنیاوی مفادات کا حامل ایک مذہب باور کرنے لگیں گے، حالاں کہ اسلام میں ہر عمل کا اصل مقصد ومنشا خوشنودیٔ رب اور آخرت کے اَجر وثواب کا حصول ہوتا ہے۔

اور سب سے بڑھ کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم سے اور آپ کے بعد صحابہؓ، تابعینؒ اور سلفِ صالحینؒ سے دینی اعمال کی یہ سب تقریریں منقول نہیں ہیں، اور ان کے غیر معتبر اور مخدوش ہونے کے لیے یہی چیز کافی ہے۔ اسی لیے اہلِ علم جو وارثینِ انبیاء ہوتے ہیں، اور جن کا مقصد دینار و درہم کا جمع کرنا نہیں ہوتا، کم از کم ایسے حضرات کو تو اس کا لحاظ بہر حال کرنا چاہیے کہ وہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں اِن اَعمال کا مقصودِ اصلی: اللہ کی رضا و خوشنودی اور موعود اجر و ثواب ہی بیان کیا کریں، عوام کے سامنے دینی اعمال کی سائنٹیفک تقریر کرنا، توحید کی روح اور اِخلاص کی حقیقت پیدا کرنے کے بجائے، مادہ پرستی کا مزاج بنانے کے مترادف ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

قرآن وحدیث میں اَعمالِ صالحہ اور ذکر واستغفار کے جو فوائد بتلائے گئے ہیں وہ سب بالعموم روحانی ترقی اور اُخروی کامیابی ہی سے متعلق ہیں، مثلاً قرآن مجید میں نماز کے بارے میں ہے: وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي [طٰہ ۱۴] (اور نماز قائم کرو مجھے یاد کرنے کے لیے)، روزے کے بارے میں ہے: كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ [البقرۃ ۱۸۳] (تمھارے اوپر روزہ فرض کیا گیا ہے جیسا کہ تم سے پہلوں پر فرض کیا گیا تھا، تاکہ تم تقویٰ اِختیار کرو)۔

ایسے ہی ایک حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں "رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا كَثِيرًا طَيِّبًا مُبَارَكًا فِيهِ" کے الفاظ سے حمد وثنا کرنے والے کے بارے میں فرمایا کہ میں نے دیکھا کہ تیس سے زائد فرشتے اس کی طرف لپک رہے ہیں کہ کون اُس کا ثواب پہلے لکھے (بخاری ۷۹۹)۔

اِسی طرح کے ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا کہ میں نے بارہ فرشتوں کو دیکھا کہ وہ لپک رہے ہیں کہ کون اس کا ثواب لے کر اللہ کے پاس جائے (مسلم ۶۰۰)۔

اِسی طرح ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تنہا "الحمد للہ" ہی میزانِ عمل کے پلڑے کو بھر دیتا ہے، اور اگر اُس کے ساتھ "سبحان اللہ" بھی ملا لیا تو پھر تو آسمان وزمین کی پوری فضا پُر ہوجاتی ہے (مسلم ۲۲۳)۔

تو دینی اَعمال واَشغال کے اصل فوائد وبرکات اور مطلوب نتائج وثمرات اِس طرح کے انوار وتجلیات ہیں، نہ کہ ملحد قسم کے سائنس دانوں اور بددین قسم کے ریسرچ اسکالروں کے بتلائے ہوئے مادّی فوائد اور نتائج، البتہ وہ بلا قصد وِارادہ ضمناً حاصل ہو رہے ہوں تو یہ اللہ کا فضل بالائے فضل ہے، ایک مؤمن

کا مقصود نہیں ہونا چاہیے۔

ایک اہم نکتہ : یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ دنیا میں کسی کو خوشی، کسی کو غمی، کسی کو فراخی، کسی کو تنگ دستی، کسی کو صحت، کسی کو بیماری اور کسی کو حکومت اور کسی کو محکومیت وغیرہ پیش آنا، یہ سب علی الاطلاق نہ تو کامیابی اور ترقی کی علامت ہے، اور نہ علی الاطلاق ناکامی اور تنزلی کی دلیل ہے، بلکہ اصل چیز شرعی اعمال واشغال کے ذریعہ تعلق مع اللہ کی توفیق ہے، جس کو یہ نصیب ہو وہ حقیقی لحاظ سے کامیاب ہے، اور جو جس قدر اِن سعادتوں سے محروم ہو وہ اتنا ہی نامراد اور ناکام ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ، مَتَاعٌ قَلِيلٌ ثُمَّ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ، لَكِنِ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا نُزُلًا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ لِلْأَبْرَارِ** [آل عمران ۱۹۶-۱۹۸]

آپ کو کافروں کا ملکوں میں دندناتے پھرنا کسی غلط فہمی میں نہ ڈال دے، یہ تو تھوڑا سا مزا ہے، پھر ان کا اصل ٹھکانہ جہنم ہوگا، اور وہ کیسا برا ٹھکانہ ہے، ہاں جنھوں نے اپنے رب کا تقوی اختیار کیا اُن کے لیے ایسے باغات ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اور اُن کا یہ اکرام بطور مہمانی کے ہوگا، اور جو کچھ اللہ کے ہاں ہے وہ نیکو کاروں کے لیے خیر کی چیز ہے۔

دراصل "دنیا" عمل اور امتحان کی جگہ ہے، بدلے اور نتیجے کی نہیں، بدلے اور نتیجے کی اصل جگہ تو "آخرت" ہے، لہٰذا دنیا میں تو بس ایمان، اعمالِ صالحہ، ذکر و دعا اور تقوی وطہارت کے ساتھ ساتھ، ہر موقع پر پیش آنے والے تقدیری فیصلوں پر تسلیم و رضا کا معاملہ کرنا، نیز (حسبِ موقع اور تقاضا) شکر، یا صبر اور حسنِ تدبیر وغیرہ کو اختیار کرتے رہنا، یہ سب مطلوب اعمال ہیں، باقی اُن کے اصل نتائج وثمرات "آخرت" ہی میں ظاہر ہوں گے۔

البتہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل وکرم سے ایمان واعمال صالحہ اور جہاد فی سبیل اللہ اختیار کرنے پر کچھ مخصوص نتائج کا وعدہ دنیا میں بھی فرمایا ہے، مثلاً اجتماعی لحاظ سے اگر یہ اعمال پائے گئے تو خلافتِ ارضی کا وعدہ ہے، اِسی طرح نماز کی بدولت روزی میں برکت ہوتی ہے، دعاؤں، معوّذات اور صدقات وخیرات کی برکت سے اللہ کی پکڑ اور بلائیں ٹل جاتی ہیں، اور موذی بیماریوں سے حفاظت ہوتی ہے، تقویٰ اور استغفار کی برکت سے عمومی عذاب نہیں آتا، اور جو کوئی مشکل پیش آتی ہے تو اس میں غیبی مدد شاملِ حال رہتی ہے، درود شریف کی برکت سے مؤمن کو ہمہ وقت فرحت اور نشاط رہتا ہے، ذہنی تناؤ وغیرہ پیش نہیں آتا..... وغیرہ ، وغیرہ۔ جیسا کہ یہ سب مضامین قرآن، حدیث، یا بزرگوں کے آثار میں متفرق طور پر پائے جاتے ہیں۔

اور اجمالی طور پر اِس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا یہ اِرشاد ہی کافی ہے: أَلَا بِذِكْرِ اللهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ، الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ طُوبَى لَهُمْ وَحُسْنُ مَآبٍ[الرعد ۲۸-۲۹]

سن لو! اللہ کی یاد ہی سے قلوب کو اطمینان حاصل ہوتا ہے، جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کیے اُن کے لیے خوش عیشی بھی ہے اور نیک انجام بھی۔

اِسی طرح نیک اعمال نہ کرنے اور تقویٰ اِختیار نہ کرنے پر اللہ کی طرف سے یہ وعید بھی وارِد ہوئی ہے: وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا[طہٰ ۱۲۴]

اور جس نے میرے ذکر سے اِعراض کیا تو اس کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔

بلکہ ایک حدیث میں تو یہاں تک ہے کہ بعض اَعمال کی برکت سے انسان کی تقدیر بھی بدل جاتی ہے، حضرت سلمان فارسیؓ سے مرفوعاً روایت ہے: لا يَرُدُّ الْقَضاءَ إلا الدُّعاءُ، ولا يَزِيدُ فِي الْعُمُرِ إلا الْبِرُّ[ترمذی ۲۱۳۹]

تقدیر کو دعاء کے علاوہ کوئی چیز نہیں بدل سکتی، اور عمر میں اِضافہ حسنِ سلوک کے علاوہ کوئی چیز نہیں کرسکتی۔

اور حضرت ثوبانؓ کی روایت میں بھی یہی مضمون اِس زیادتی کے ساتھ وارِد ہوا ہے: "وَإِنَّ الرجلَ لَيُحرَمُ الرِّزقَ بالذَّنبِ يُصِيبُه"[ترمذی ۳۰۶۹]

اور بعض مرتبہ آدمی کے لیے کوئی رزق مقدر کیا جاتا ہے، مگر وہ کوئی ایسی غلطی کر بیٹھتا ہے کہ پھر اس کو اس رزق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی مشیئت سے ہمارے بعض اَعمال اور اَحوال، بعض مرتبہ تکوینی فیصلوں اور تقدیری نوشتوں پر بھی اثر انداز ہو جاتے ہیں!۔

البتہ عمومی قانون اور نظام وہی ہے کہ اچھے برے تمام اَعمال واَحوال کے بدلے اور نتیجے کی اصل جگہ "آخرت" ہے، "دنیا" اصلاً دار العمل اور دار الامتحان ہے، دار الجزاء نہیں۔

اللهم وَفِّقْنَا لِمَا تُحِبُّ وتَرضَى، واجْعَلْ آخِرَتَنا خيرًا مِنَ الأُولَى، ولا حولَ ولا قوةَ إلا بالله العلي العظيم. (جاری)

علمی تحقیق گذشتہ سے پیوستہ

کیا قرآنِ کریم میں سائنس کی تعلیم بھی ہے؟

مولانا محمد معاویہ سعدی
استاذ شعبۂ تخصص فی الحدیث مظاہر علوم سہارنپور

اپنے ذوقِ تحقیق کی تسکین کے لیے قرآن وحدیث کے نصوص میں مستور اسرار ورموز کی تلاش، اور دینی احکام ومسائل میں موجود عِلل وحِکَم کی تحقیق یہ تو الگ موضوع ہے، جس کی تفصیل گذشتہ شمارہ میں پیش کی گئی۔

یہاں ایک مسئلہ یہ بہت اہم ہے کہ بعض حضرات دوسروں کو جواب دینے کے لیے قرآن وحدیث میں اِن اُمور کی تحقیق کرتے ہیں، پھر اُن میں دو طرح کے لوگ ہیں:

ا۔ کچھ تو وہ لوگ ہیں جو نعوذ باللہ قرآن وحدیث سے زیادہ سائنس اور مغربی تحقیقات پر یقین رکھتے ہیں، اور سائنس واہلِ مغرب کے ہر دعوے کو مِن وعَن قبول کر کے، قرآن وحدیث سے اُس کی تائید پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، بلکہ اُن میں بہت سے ایسے بھی ہیں کہ جہاں تطبیق بن نہیں پاتی وہاں بجائے اِس کے کہ قرآن وحدیث کو قبول کر کے، سائنس اور مغربی مزعومات کو ٹھکرا دیتے، اور "ایمان بالغیب" کا ثبوت دیتے، اِس کے برعکس وہ لوگ ملحدین کے مزعومات کو قبول کر کے، اُن کو مطمئن کرنے کے لیے، نعوذ باللہ قرآن وحدیث میں رکیک تاویلات کرتے ہیں، اور اس کے ذریعہ بزعمِ خود دین کا دفاع اور دین کی خدمت کرتے ہیں!۔ حالاں کہ اُن کی یہ کوشش درحقیقت سائنس اور اہلِ مغرب کا دفاع اور اُن کی خدمت ہے، اِسلام کی نہیں!!۔

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:

> قرآن شریف کو کیا کھیل بنایا ہے لوگوں نے! نہ معلوم عقلیں کیسی مسخ ہوئی ہیں؟ یہ طرف داری دِین کی ہے، یا سائنس کی؟!
>
> موٹی سی بات ہے کہ دِین کی طرف داری تو جب ہوتی کہ دِین کو تسلیم کر کے سائنس کو اس کے مطابق کرتے، یہ طرفداری دین کی کیسی ہوئی کہ سائنس کو تسلیم کر کے دِین کو اس کے مطابق کرنا چاہتے ہیں!۔

یہی فرق ہے علمائے اہلِ حق اور آج کل کے لوگوں کی رَوِش میں، علمائے اسلام نے بھی احکامِ شریعت میں عقلی مصالح دریافت کی ہیں، اور اِس مبحث پر کتابیں لکھی ہیں، جن سے یہ لوگ بھی استدلال کرتے ہیں کہ علمائے حال کا جمود اور تعصب ہے کہ جب ہم عقل اور نقل کو مطابق کر کے دکھاتے ہیں، ہم پر اِعتراض کرتے ہیں، حالاں کہ ان کے علماء نے بھی ایسا کیا ہے!۔

(حالاں کہ) یہ صرف مغالطہ ہے، اگلے علماء نے دِین کو مقدم رکھ کر، عقل سے اس کی مصلحتیں دریافت کی ہیں، اور یہ لوگ عقل (اور سائنس) کو مقدم رکھ کر دین کو اس کے مطابق کرنا چاہتے ہیں۔ [اقتباس بحوالہ مضمون : مولانا حکیم فخرالاسلام صاحب مظاہری زیدہم]

۲ــ دوسرے کچھ حضرات وہ ہیں جن کو دینی اَحکام ومسائل پر مکمل اعتماد ویقین اور کتاب وسنت کی باتوں پر پورا پورا ایمان حاصل ہوتا ہے، اور وہ صرف اِسلام کی برتری اور حقانیت کے اثبات کے طور پر، اِس طرح کے موضوعات سے دلچسپی رکھتے ہیں، اور اہلِ سائنس کو "عطائے تو بہ لقائے تو" (تمھاری چیز تم ہی کو واپس) کے اُصول سے مجوج کرنا چاہتے ہیں کہ دیکھو جو تمھاری سائنس آج کہہ رہی ہے، وہ بات ہمارے ہاں چودہ سو سال پہلے سے موجود ہے۔

یہ بظاہر تو بہت اچھا نقطۂ نظر ہے، اور اِسی پہلو سے گذشتہ ڈیڑھ سو سالوں میں مسلمانوں کے مختلف حلقوں کی طرف سے "اسلام اور سائنس"، "قرآن اور سائنس" اور "سنتِ نبوی اور جدید سائنس" وغیرہ عنوانات پر بیسیوں، بلکہ شاید سیکڑوں کتابیں، مقالات اور مضامین لکھے جا چکے ہیں۔

البتہ اِس کے متعلق ایک سلسلۂ گفتگو میں حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:

...کسی نصِّ شرعی نے نہ اس (حرکتِ ارض) کا اِثبات کیا ہے نہ نفی کی ہے، پس اِثباتاً یا نفیاً یہ مسئلہ اِسلامی اور شرعی نہیں ہے، محض ایک عقلی (اور مشاہداتی) مسئلہ ہے، دونوں جانب احتمال اور گنجائش ہے، اور کسی (بھی) احتمال پر کسی آیت وحدیث پر کوئی اشکال لازم نہیں آتا...

اور محض اِس فخر کے حاصل کرنے کو یہ تفسیر کرنا کہ جس مسئلہ کو بہت تحقیق کے بعد جدید فلسفہ نے اب دریافت کیا ہے ہزاروں برس پہلے وہ مسئلہ اسلام میں حل ہو چکا ہے؛ محض فضول ہے۔

اول تو بعد اِثباتِ قدامت اِس مسئلہ کے، کوئی مخالف یہ شبہ کرسکتا ہے کہ اسلام نے اپنی تحقیقات میں قدمائے حکماء سے اقتباس کیا ہے (جیسا کہ اس کی تفصیل بھی حضرتؒ نے لکھی ہے، اور جیسا کہ آج کل اِس کا تجربہ بھی ہو رہا ہے)، سو یہ فخر تو اور اِہانت ہو گیا۔

دوسرے قرآن جس فن کی کتاب ہے اس میں سب سے ممتاز ہونا، یہ فخر کی بات ہے، یعنی

اثباتِ توحید و اِثباتِ معاد و اصلاحِ ظاہر و باطن۔ اگر سائنس کا ایک مسئلہ بھی اس میں نہ ہو کوئی عیب نہیں، اور اگر سائنس کے سب مسئلے ہوں تو فخر نہیں، قرآن کو ایسی خیر خواہی کی ضرورت نہیں، واللہ تعالیٰ اعلم" (امداد الفتاوی، ج ۶ ص ۱۶۲—۱۶۰)۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

آج کل یہ مرض عام ہو گیا ہے کہ دنیوی مقاصد اور سائنس کے مسائل کو زبردستی قرآن میں ٹھونسنا چاہتے ہیں، جو نہایت ہی خطرناک بات ہے، اور یہ اس کو فخر سمجھتے ہیں، میں ہمیشہ اِس طرز سے منع کرتا ہوں، قرآن پاک کا یہی فخر ہے کہ اس میں غیر دین کچھ نہیں ہے...، بہت سے دشمن، دوست نما ہوتے ہیں کہ دوستی کی پردے میں دشمنی کرتے ہیں، یہ طرز اسلام کے ساتھ دوستی نہیں دشمنی ہے، اگر آج ایسی چیزیں تم نے قرآن پاک سے ثابت کر دیں اور کل کو وہ تحقیق کے بعد غلط ثابت ہوئیں تو کیا یہ قرآن کی تکذیب کا سامان نہیں کر رہے ہو؟! (ملفوظات، الافاضات الیومیہ ۶/۷۸)۔

ایک اور جگہ فرمایا :

... میں سچ کہتا ہوں کہ سائنس کو قرآن میں داخل کرنا؛ چند روز میں دین کو بالکل منہدم کرنا ہے، کیونکہ کہ سائنس کی تحقیقات بدلتی رہتی ہیں، آج جو بالاتفاق تسلیم کی جاتی ہیں وہ کل کو ایسی غلط ثابت ہوتی ہیں کہ اس پر وہی لوگ ہنستے ہیں جن کی وہ تحقیق تھی۔

یہ طریق جو اختیار کیا گیا ہے یہ سخت مضر ہے۔ اِس میں بڑی دشمنی ہے اِسلام کے ساتھ، اِس لیے کہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ سائنس کے مسائل منقح نہیں ہوئے، اور اِس کو اہلِ سائنس بھی مانتے ہیں کہ ہم کو اَب تک اِس دریا کا قطرہ بھی حاصل نہیں ہوا۔

اگر آج قرآن کو بھی اس کے مطابق کر لیں تو جس وقت اس کی غلطی ثابت ہوگی اُس وقت قرآن کریم کا غلط ہونا بھی ثابت ہو جائے گا۔ پھر قسمت کو روئیو!

لوگ اِدھر اُدھر کے مسائل کو قرآن شریف سے ثابت ہونے کو فخر سمجھتے ہیں، قرآن کا فخر یہ ہے کہ اس میں غیر دین نہیں ہے، جیسا کہ "طبِّ اکبر" (نامی طب کی مشہور کتاب) کے لیے فخر ہو سکتا ہے تو یہ ہی کہ اسمیں جوتے گانٹھنے کا بیان نہیں ہے، نہ یہ کہ اس میں کہیں جوتیاں گانٹھنے کی ترکیبیں بھی درج ہوں، اگر کوئی "طب اکبر" میں یہ صنعت بھی شامل کر دے تو واللہ کوئی اس کو ہاتھ بھی نہ لگائے!"۔

"ایک صاحب نے مَنی میں کیڑے ہونے کا ثبوت قرآن کریم سے دیا، سورۃ اقرأ میں لفظِ مِنْ عَلَقٍ سے، کہ "علق" جونک کو کہتے ہیں اور "علق" اور کیڑا (جونک) ایک ہی چیز ہے، ہمارے قرآن میں وہ چیزیں موجود ہیں جو اَب تیرہ سو برس کے بعد لوگوں کو معلوم ہوئیں۔

(احقر عرض کرتا ہے کہ یہاں یہ واضح رہے کہ اصل مسئلہ منی میں کیڑے کے ہونے نہ

ہونے کا نہیں ہے، بلکہ قرآن سے اُس کے ثبوت کا ہے، جو بہر حال نہیں ہوتا)

دین میں ایسی جرأت ہوئی ہے لوگوں کو کہ ہر شخص دخل دینے کو تیار ہے، لغت تک کے علم کی ضرورت نہیں رہی! ہر کیڑا تو جونک نہیں، اور منی میں جونک نہیں، اور مجاز کی کوئی دلیل نہیں، پھر القرآن یفسر بعضہ بعضاً۔ چنانچہ دوسری آیت میں فرمایا ہے: {مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُضْغَةٍ} [الحج ۵] جس سے صاف واضح ہوا کہ "علق" ایسی کوئی چیز ہے جو "نطفہ ومضغہ" کے درمیان ہے، تو وہ خونِ بستہ ہے، اور کیڑا تو نطفہ کے ساتھ ہوتا ہے، نہ کہ نطفہ اور مضغہ کے قبل۔ پس "علق" کے معنی عرب میں خونِ بستہ کے ہیں۔

کیا یہ قرآن سے عقیدت اور محبت ہے کہ اس میں وہ چیزیں داخل کی جاتی ہیں جن کو اس کی زبان بھی شامل نہیں، اور ان خرافات کو حمایتِ دین کہا جاتا ہے؟!!۔

ایک صاحب نے قرآن شریف سے یہ ثابت کرنا چاہا کہ دانہ میں نصف مادہ اور نصف نر ہوتا ہے، یہ بھی سائنسِ جدید کی تحقیق ہے، اِس کے لیے ان کو یہ آیت مل گئی: {سُبْحَانَ الَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ وَمِنْ أَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُونَ} [یٰس ۳۶]، معلوم ہوا کہ "مماتنبت الارض" (زمین کی پیداوار) میں بھی ازواج یعنی میاں بیوی ہیں۔

(انھوں نے "ازواج" کا ترجمہ "میاں بیوی" سے کیا، حالانکہ "زوج" کے یہاں یہ معنی نہیں ہیں، بلکہ اس سے مراد نسبتِ تقابل ہے، خواہ وہ کسی بھی طور پر ہو، جیسے کہ میاں بیوی، یا آسمان وزمین، جوہر وعرض، گرمی وسردی، شیریں وتلخ، چھوٹی وبڑی، خوشنما وبدنما، سفیدی وسیاہی، روشنی وتاریکی... وعلیٰ ہٰذا)۔

جو جس کی سمجھ میں آتا ہے کہتا ہے، نہ معلوم یہ لوگ {وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ} [التکویر ۷]، کے کیا معنی کرتے ہوں گے؟! "تزویج" باب تفعیل ہے "زوج" سے۔ اِس کے معنی ان کی تقریر کے موافق میاں بی بی بنانے کے ہوئے۔ تو یہ معنی ہوئے کہ قیامت کے دن لوگوں کے نکاح کرائے جائیں گے! (حالاں کہ آیت کے اصل معنی یہ ہیں: جب ایک ایک قسم کے لوگ اکٹھے کئے جاویں گے (کافر الگ، مسلمان الگ، پھر اُن میں ایک ایک طریقہ کے الگ الگ)، جیسا کہ دوسری جگہ ہے: {وَكُنْتُمْ أَزْوَاجًا ثَلَاثَةً} [الواقعۃ ۷]۔

اکثر نئی روشنی والے تو ایسے احمق ہیں کہ جہاں کوئی نئی بات دیکھتے ہیں کہتے ہیں کہ واہ کیا عجیب تحقیق ہے؟! پرانی بات کیسی ہی ہو اُس کو پسند نہیں کرتے، اُن کا یہی مذاق ہے، اور ہم مذاق میں مزاحمت نہیں کرتے، مگر اس مذاق کی تائید میں قرآن وحدیث پر کیوں مشق کرتے ہیں؟ ناگواری اس پر ہوتی ہے۔

مگر آج کل کے مدعیانِ عقل کا مذاق یہ ہو گیا ہے کہ ہر چیز کو قرآن شریف میں ٹھونسنا چاہتے ہیں،

خواہ وہ چیز قرآن سے کچھ بھی تعلق نہ رکھتی ہو۔ چنانچہ ایک صاحب نے {وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ} [التکویر ۱۰] کی تفسیر میں لکھا ہے کہ قیامت کے قریب اخبار بہت جاری ہو جائیں گے ... الخ" (حالاں کہ یہاں مراد لوگوں کے نامۂ اعمال ہیں جو قیامت کے دن ان کے سامنے کھولے جائیں گے)۔

(ملخصاً از اطاعت الاحکام ص ۱۶۔ اشرف الجواب ص ۳۳۶۔ بتصرف)۔

حضرت فرماتے ہیں:

قرآنِ کریم میں جس قدر فہم کی ضرورت ہے اس کے لیے کتنے آلات کی ضرورت ہے، جیسے صرف، نحو، منطق، حدیث، تفسیر، ادب، فقہ، معانی وغیرہ وغیرہ۔ اصل تو اتنی ہے، اگر یہ نہ ہو تو مجبوری میں ان سب کے قائم مقام یہ ہے کہ کسی عالم محقق سے پڑھ لیں، یہ بھی نہ ہو تو سوائے گمراہی کے کچھ نہیں۔

چنانچہ میں نے وعظ میں بیان کیا کہ کسی سے ترجمہ نہ پڑھنے اور خود دیکھنے میں بڑی بڑی خرابیاں ہیں ۔ رہا "بینات" (کھلی ہوئی نشانیاں) وغیرہ جو الفاظ آئے ہیں قرآن مجید میں؛ سو میں نے کہا کہ اول تو وہ مبادی حاصل کرنے والے کی نسبت ہے (یعنی جس نے قرآن فہمی کی بنیادی شرائط پوری کرلی ہوں اُس کے لیے ایسے مضامین آسان ہیں)۔

دوسرے علومِ قرآن کی نصیحت کے دو جزو ہیں: ایک ترغیب وترہیب، دوسرا تحقیقات۔ سو ترغیب وترہیب کا جزو تو مشکل نہیں، مثلاً قیامت کے لیے تیاری کرو، دوزخ سے بچنے کی سعی کرو، جنت حاصل کرنے کی فکر کرو، وغیرہ وغیرہ۔ یہ تو دقیق نہیں، اِس کے اعتبار سے مطلقاً "بینات" ہے۔

باقی تحقیقات کا جزو تو وہ مشکل ہے، اور میں نے واقعات سے بھی ثابت کیا تھا کہ صحابہ تک کو غلطی واقع ہوتی تھی تو آپ سے پوچھتے تھے، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ آپ ﷺ سے زیادہ فہیم کون ہوگا؟ مگر خود آپ کے بارے میں حق تعالی فرماتے ہیں: {ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ} [القیامۃ ۱۹]، کہ ہمارے ذمہ ہے اس کا بیان کرنا، سو جب آپ کو بھی ضرورت تھی بیان کی تو اوروں کی تو کیا حقیقت ہے!۔

میں نے یہ بھی کہا تھا کہ اِس سے معلوم ہوا کہ علاوہ قرآن کے کوئی دوسری چیز بھی ہے جس سے اس کی تعیین وتوضیح ہوتی ہے (اور ظاہر ہے کہ وہ حدیث ہی ہوگی، جیسا کہ خود قرآن میں اِس کی طرف صاف اِشارہ موجود ہے: {وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ} [النحل ۴۴]

(ملفوظات ج ۱۹، حسن العزیز ج ۳ ص ۲۴۱، ۲۴۰)۔

ایک جگہ فرماتے ہیں:

فروعی مسائلِ اسلام کو عقل سے ثابت کرتے ہیں، اور اس کی خبر نہیں کہ اِس طرح جڑ اِسلام کی کٹتی جاتی ہے۔ اِس مرض میں ہمارے بھائی بند بھی یعنی مولوی لوگ بھی مبتلا ہیں، اور اِس کی وجہ صرف حبِّ شہرت اور بعض میں حبِّ مال، اور اپنی ضرورتوں کو اہلِ دنیا کے پاس لے جانا ہے۔ ان

سے عطایا لینے کے بعد ان کو کچھ دینا پڑتا ہے، اور اُن کی حسبِ خواہش دین کو سائنس کے ساتھ مطابق کرنا پڑتا ہے، ورنہ اُن کی نظروں میں وقعت نہ ہو، اور عطایا میں کمی ہو جائے، یہ ہے وہ چیز جس نے ناس کر رکھا ہے (ملفوظات حکیم الامت ج ۲۰ ۔حسن العزیز ج ۴ ص ۱۸۵، ۱۸۷)۔

[اقتباسات بالا بحوالہ مضمون : مولانا حکیم فخر الاسلام صاحب مظاہری زیدہم]۔

احقر عرض کرتا ہے کہ دفاعِ اسلام کے پہلو کے تحت بھی قرآن وحدیث کی جو سائنسی تحقیقات کی جاتی ہیں، حضرتؒ کے اِن اِرشادات سے اس طرزِ عمل اور نقطۂ نظر کی بھی تغلیط ہوتی ہے، اِس لیے کہ اِس میں قرآن وحدیث کے موضوع میں خلط ہوتا ہے، اور بعض مرتبہ اِس معاملہ میں غلو کی وجہ سے مقصدِ اصلی سے اِنحراف تک لازم آنے لگتا ہے، اور سب سے بڑھ کر ''اِیمان بالغیب'' کا جذبہ کمزور پڑ جاتا ہے، اور انسان مادی تحقیقات کو اصل سمجھنے لگتا ہے، جس کی قباحت ظاہر ہے۔

یہ واضح رہے کہ یہ سب باتیں خاص اُن لوگوں سے متعلق ہیں جو پہلے سے اِیمان کی دولت سے مشرف اور اہلِ حق کے سلسلے سے وابستہ ہیں، ایسے لوگوں کو قرآن وحدیث سے سائنسی انکشافات کی فکر میں نہیں پڑنا چاہیے، بلکہ اُن کے اَصل موضوع اور مقصد کو ذہن میں رکھتے ہوئے اُن سے اسی پہلو سے خود بھی منتفع ہونا چاہیے، اور دوسروں کو بھی اِیمان بالغیب ہی کی دعوت دینی چاہیے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر آج تک تمام اہلِ حق کا یہی طریقہ رہا ہے۔

تاہم اگر کسی غیر کو قرآن وحدیث کی تحقیق کا از خود شوق ہو جائے، اور وہ اپنے تئیں تقابل اور تحقیق کا کام کرنا چاہے، اور قرآن وحدیث کے الفاظ وتعبیرات پر ریسرچ کرنے کا ارادہ کرے تو ایسے لوگوں کے لیے تو قرآن کا یہ دعویٰ موجود ہی ہے: ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ (یہ ایسی کتاب ہے جس کے اندر کوئی شک وشبہ کی بات نہیں) یعنی اس کا ہر دعوی برحق، ہر خبر درست، اور ہر بات یقینی ہے، لہٰذا جس کو جو ریسرچ کرنی ہو کر لے۔

اَب اگر اُن کی تحقیقات اور ریسرچ سے قرآن وحدیث کی تصدیق ہوتی ہے (اِس طور پر کہ اُن کا نتیجہ قرآن وحدیث کے موافق آجائے)، اور ''اِیمان بالغیب'' سے محروم مادہ پرست افراد وطبقات اُن تحقیقات سے مجوج ہوتے ہیں، تو یہ ایک شر سے نکلنے والا خیر ہے، جس کی علی الاطلاق تائید اور حوصلہ افزائی تو نہیں کی جاسکتی، ہاں ضرورت کے موقع پر موقع سے فائدہ ضرور اُٹھایا جاسکتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

علمی تحقیق گذشتہ سے پیوستہ

کیا قرآنِ کریم میں سائنس کی تعلیم بھی ہے؟

مولانا محمد معاویہ سعدی

استاذ شعبۂ تخصص فی الحدیث مظاہر علوم سہارنپور

ایک پختہ فکر مسلمان اپنے ذوقِ تحقیق کی تسکین اور عین الیقین کی تحصیل کے لیے شرعی اَحکام ومسائل کی علتوں کی، یا کائناتی نظام کے اَسرار وحِکَم کی تحقیق کرسکتا ہے، البتہ اس کے لیے چند شرطیں ہیں، جن میں سے پہلی دو شرطوں سے متعلق تفصیلی گفتگو بتوفیقہ تعالی گذشتہ صفحات میں کی جاچکی۔

تیسری اور آخری شرط: یہ ہے کہ اگر کسی کو ذاتی طور پر اپنے ذوقِ تحقیق کی تسکین اور عین الیقین کی تحصیل کے لیے اَسرار وحِکَم کی جستجو کا شوق ہو، تو وہ مذکورہ شرائط کے ساتھ اپنا شوق پورا کرے، مگر جو لوگ کہ اِس مذاق ومزاج سے دلچسپی نہیں رکھتے، جیسے اکثر صحابہؓ، تابعینؒ اور سلفِ صالحینؒ، اور جیسا کہ یہی جنتی لوگوں کا اصل مزاج ومذاق بھی ہے، بفحوائے حدیثِ صحیح: قَالَتِ الْجَنَّةُ: فَمَا لِي لَا يَدْخُلُنِي إِلَّا ضُعَفَاءُ النَّاسِ وَسَقَطُهُمْ وَغِرَّتُهُمْ؟ [بخاری ۴۸۵۰، ومسلم ۲۸۴۶] (جنت کہے گی: کیا بات! میرے اندر زیادہ تر کمزور، گرے پڑے اور سادے سودے لوگ ہی داخل ہو رہے ہیں؟ ... (برخلاف جہنم کے کہ اس میں زیادہ تر وہ متکبر لوگ ہوں گے جو دنیا میں اپنی عقلوں پر غرہ کیا کرتے تھے، اور محض عقل کی بنیاد پر اللہ ورسول کی باتوں کو ٹھکرایا کرتے تھے، یا ان میں شکوک وشبہات پیدا کیا کرتے تھے)۔

ایک اور حدیث میں ہے: "أَكْثَرُ أَهْلِ الْجَنَّةِ الْبُلْهُ" [مسند البزار ۶۳۳۹ بسند ضعیف] (اکثر اہلِ جنت سیدھے سادے لوگ ہوں گے)۔

تو "مصالحِ عقلیہ" سے دلچسپی رکھنے والا ایسے حضرات کی تحقیر وتنقیص نہ کرے، اور اُن کے یہاں اِس مذاق کے نہ ہونے کو اُن کی کم علمی پر محمول نہ کرے، اِس لیے کہ یہ چیزیں اُن علوم کا حصہ نہیں ہیں جو دین میں ضروری اور مطلوب ہوں، بلکہ یہ اِضافی علوم میں سے ہیں، جیسا کہ تفصیل سے یہ مضمون پہلے گذر چکا ہے۔

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں :

ایک مرتبہ صحابہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تھا کہ چاند کے گھٹنے بڑھنے کی کیا وجہ ہے؟اس پر یہ آیت نازل ہوئی یَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ (لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے چاند کی حالت کی تحقیقات کرتے ہیں، آپ فرمادیجئے کہ وہ چاند آلۂ شناختِ اوقات ہیں)،جس میں وجہ اور علت نہیں بیان کی گئی، بلکہ حکمت بتلادی گئی، اِس سے (تدبرِ آیات کے لیے) سائنسدانی کا فضول ہونا یقینا ثابت ہوگیا (مقدمۂ اشرف التفاسیر ۱؍۴۵)۔

اِسی طرح جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ''روح'' کی حقیقت کے بارے میں سؤال کیا گیا،جب بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کی حقیقت کی خبر نہیں دی گئی، بلکہ جتنا حصہ عقیدے سے متعلق تھا وہ بتلا کر آگے یہ اِرشاد فرمادیا گیا:وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا [الاسراء۸۵] (تمھیں جو علم دیا گیا ہے وہ بہت تھوڑا سا دیا گیا ہے)۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں :

..... جتنی بات کا بتلانا ضروری تھا اور جو عام لوگوں کی سمجھ میں آنے کے قابل ہے، صرف وہ بتلادی گئی، اور روح کی مکمل حقیقت جس کا سوال تھا، اس کو اِس لیے نہیں بتلایا کہ وہ عوام کی سمجھ سے باہر بھی تھی، اور اُن کی کوئی ضرورت اس کے سمجھنے پر موقوف بھی نہ تھی...، انسان کے لئے اتنا ہی علم روح کے متعلق کافی ہے (کہ روح میرے پروردگار کے حکم سے ہے، یعنی وہ عام مخلوقات کی طرح نہیں جو مادہ کے تطوُّرات اور توالُد وتناسل کے ذریعہ وجود میں آتی ہیں، بلکہ وہ بلاواسطہ حق تعالیٰ کے حکمِ ''کُن'' سے پیدا ہونے والی چیز ہے)۔

اِس سے زائد علم کے ساتھ اِس کا کوئی دینی یا دنیوی کام اٹکا ہوا نہیں، اِس لیے وہ حصۂ سوال فضول اور لایعنی قرار دے کر اُس کا جواب نہیں دیا گیا...، اِمام بخاریؒ نے کتاب العلم میں اس مسئلے کا ایک مستقل ترجمۃ الباب رکھ کر بتلایا ہے کہ جس سوال کے جواب سے مغالطہ میں پڑنے کا خطرہ ہو اُس کا جواب نہیں دینا چاہیے'' انتہی ملخصاً۔

یہی وجہ ہے کہ اگر کسی کو کسی امرِ تکوین کی علت، یا حکمِ تشریعی کی مصلحت خود سمجھ میں آجائے اور وہ اُس کو دوسروں تک نہ بھی پہنچائے جب بھی نہ کوئی مؤاخذہ ہوگا، اور نہ ہی کتمانِ علم کا گناہ ہوگا۔

حضرت تھانویؒ کا اِرشاد ہے :

... آپ یوں کہیں کہ اَحکام: قوانین ہیں، اُن کے اَسرار: اَسرارِ قوانین ہیں، اور ہم قانون

کے جاننے والے ہیں، اسرارِ قانون ہم نہیں جانتے، نہ اُن کا بتلانا ہمارے ذمہ واجب ہے...، ہم عالمِ قانون ہیں، واضعِ قانون خدا تعالیٰ ہیں، مصالح اُن سے پوچھ لینا، وہ جواب دیں گے؛ خواہ اَسرار بتلانے سے،خواہ دِماغ کی اِصلاح کرنے سے!'' اھ (فوائد الصحبۃ ص۲۷ : مختصراً)۔

ساری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ دینی اعمال واَشغال کے اَسرار وحِکَم کو فی نفسہ جاننے کی کوشش کرنے میں تو کچھ حرج نہیں، بلکہ فی الجملہ علمی ذوق کی علامت اورسعادت ہی کا حصہ ہے،اور کبھی دفاعِ دین کے مقصد سے ان کا حوالہ دینے کی بھی گنجائش ہے،مگرعمل کے لحاظ سے دینی عبادات کوخالص روحانی اور اُخروی (رضائے الٰہی،شوقِ جنت اور خوفِ جہنم کے) نقطۂ نظر سے ہی دیکھنااور کرنا چاہیے، ان کی طبی اور سائنسی توجیہات بیان کرنا،خطرے والاراستہ ہے۔

خوب اچھی طرح سمجھ لیں کہ ایک تو ہے شرعی اَعمال میں دنیوی نیت شامل کرلینا،مگراُس کوخالص شرعی عمل اورروحانی وظیفہ ہی سمجھنا، جیسا کہ لوگ دنیاوی مقاصد کے لیے اللہ کے نام کی برکت حاصل کرنے کے لیے دعائیں اوروظائف وغیرہ پڑھتے ہیں، یہ (بعض مرتبہ) اِخلاص کے منافی توہوسکتا ہے، مگر اِس میں تحریفِ دین نہیں ہے، اِس لیے کہ اِس میں اصل مقصوداُن اَعمال کے ذریعہ اللہ کی رحمتوں اور برکتوں کا حصول ہوتا ہے، جوعین مطلوب ہے، جیسے صدقہ دینے سے بلائیں ٹلتی ہیں،سورۂ واقعہ پڑھنے سے فاقہ نہیں ہوتا۔۔وغیرہ وغیرہ۔

اِس کے برعکس خالص دینی اَعمال واَشغال کی سائنسی توجیہات کرنا، اور اِس نقطۂ نظر سے اُن کو انجام دینا(کہ طویل سجدہ کرنے سے دماغ کی رگیں کھلتی ہیں، اوررکوع کرنے سے کمرصحیح ہوجاتی ہے... وغیرہ وغیرہ)، یہ سب قلبِ موضوع اورتحریفِ دین کا حصہ ہے، جو مادّیت سے ناشی ہے، اورسلفِ صالحین کے منہج سے منحرف راستہ اوردورِجدید کی پیداوار ہے۔

اِسی طرح خالص دنیاوی اَعمال (ورزش وغیرہ) کوشرعی اصطلاح اورتعبیر دینا (کہ رکوع والی ورزش،سجدے والی ورزش وغیرہ وغیرہ)، یہ شرعی اصطلاحات کابے محل اِستعمال اوراِستحصال ہے، جوبجائے خودضلالت وگمراہی ہے۔واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب

مقصدِ چہارم : کچھ لوگ نصوصِ شرعیہ (قرآن وحدیث کے الفاظ وتعبیرات) میں جسمانی غذا

ودوا، اور دیگر طبی وتمدنی فائدوں کے پہلوؤں سے بھی غور وفکر کرتے ہیں، یہ اُمور قرآن وحدیث کا موضوع تو بہر حال نہیں ہیں، ہاں البتہ ضمنی طور پر قرآن وحدیث سے ان چیزوں کے ثبوت کا بالکلیہ انکار بھی نہیں کیا جاسکتا۔

جاننا چاہیے کہ دراصل یہ دنیاوی علوم وفنون اِنسان کی فطرت اور آدمی کی بشری ضروریات کا حصہ ہیں، جیسا کہ مشہور تفسیر کے مطابق {وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا} [البقرۃ۳۱] میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اِسی لیے اِن علوم کو "علومِ آدمیت" یا "اِنسانی علوم" بھی کہا جاتا ہے، جو کائناتی نظام میں تعقل وتدبر اور مشاہدہ وتجربہ کا سلسلہ جاری رکھنے سے خود بخود حاصل ہوتے رہتے ہیں، اِن کے لیے کسی آسمانی وحی اور نبوت ورسالت کا سلسلہ قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اِسی لیے اِن کو نہ تو قرآن وحدیث نے اپنا موضوع بنایا اور نہ ہی صحابہؓ وتابعینؒ اور سلفِ صالحینؒ نے، ہاں کتاب وسنت میں اِس سلسلے کے کچھ ایسے بنیادی رہنما اُصول ضرور ملتے ہیں جن پر عمل کرنے سے دین کے ساتھ ساتھ اِنسان کی دنیا بھی سنور سکتی ہے، اور اُن کے ذریعے قلب کا سکون اور دارین کا راحت وآرام بھی حاصل کیا جاسکتا ہے، مگر اُن کو موجودہ مادّی اور اِستدراجی "ترقیات" (واِختراعات) کا موضوع ثابت کرنے کی کوشش؛ یہ نہایت بے محل جسارت ہے۔

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں :

> اِسلام اِیجادات تو نہیں سکھاتا، لیکن اصولِ ایجادات کی تعلیم دیتا ہے، مثلاً یہ کہ کسی اِیجاد کو اِس طرح اختیار نہ کرو جس سے دین میں خلل ہو، یا جان کا خطرہ ہو، یا یہ کہ بے ضرورت اِیجادات کے درپے ہو کر ضروری کاموں کو ضائع نہ کرو، اور ضروری اِیجادات میں اِس کا لحاظ رکھو کہ موہوم منفعت کے لیے خطرۂ قویہ کا تحمل نہ کرو۔ (ملفوظات ج ۲۱، انفاسِ عیسیٰ، حصہ اول ص ۳۴۶)۔

امید کہ اِس تفصیلی گفتگو کی روشنی میں اِس سؤال کا کہ "کیا قرآن میں سائنس کی بھی تعلیم ہے؟" واضح جواب حاصل ہو گیا ہوگا۔

وَمَاتَوْفِيقِي إِلَّا بِاللهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ، وصلى الله وبارك وسلم على نبينا محمد، وعلى آله وصحبه أجمعين، وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين.